مولانا ابوالکلام آزاد

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ط(۴:۵۹)

تم مسلمان جو ایک زمانے میں اللہ اور اس کے دین برحق کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔ کیا اب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس کے احکام اس کے غافل بندوں تک پہنچادو؟ تم کو آرام نہیں لینا چاہیے جب تک کم از کم دس مسلمانوں تک وہ تمام احکام نہ پہنچادو جو اس رسالہ میں درج ہیں' اور چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کو وصیت کرد کہ اسی طرح دس آدمیوں تک پہنچادے۔
فلیبلغ الشاهد الغائب' فان الشاهد عسی ان یبلغ من هو اوعی له منه.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۵:۱٦)

کیا مسلمانوں کے لیے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھک جائیں اور غفلت و نافرمانی سے باز آئیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو مسلمانوں ہی کی طرح کتاب الٰہی دی گئی تھی (یعنی یہود) لیکن جب ایک بڑی مدت گزر گئی تو غفلت میں رہتے رہتے ان کے دل سخت ہو گئے، احساس جاتا رہا، غیرت و حمیت مٹ گئی۔ سچے دلوں کی وہ نرمی اور اثر پذیری نہ رہی جو صدائے حق سنتے ہی چونک اٹھتی ہے۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟ (۵۴:۱۵)

مولانا ابو الکلام آزادؒ

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون 7232731

نام کتاب ——— مسئلہ خلافت

مصنف ——— مولانا ابوالکلام آزادؒ

اہتمام ——— وقار احمد / شکیل احمد

ناشر ——— مکتبہ جمال

مطبع ——— اصغر پریس

سن اشاعت ——— 2006

قیمت ——— ۱۲۰ روپے

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 7232731

Email: maktaba_jamal@email.com
maktabajamal@yahoo.co.uk

فہرست مضامین

عرض ناشر

مسئلہ خلافت پر جس جامعیت اور ہمہ گیریت سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے راہوار قلم کو مہمیز دی ہے' وہ صرف اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے قارئین پر واضح ہو سکتی ہے۔ امام الہند نے خلافت کی لغوی کنہہ سے لے کر معنوی انتہا تک سفر جس شان سے اس کتاب میں قطع کیا ہے' اس کے سامنے فکر و نظر کی ساری جولانیاں ماند پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ امام الہند جس طرح بحث کو "وامرهم شوریٰ بینهم" کے سٹیج سے اٹھا کر "انا امر کم بخمس......" کے میدان میں لائے ہیں اور پھر اسے ایک مرکز......المرکز الجامع......تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ صرف اس کتاب کو پڑھنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

تاہم سلاطین عثمانیہ کے حوالے سے ان کا موقف اس وقت کے ہندوستان کے کل علماء کرام کا متفقہ مؤقف تھا بلکہ اس وقت ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں نے اس وقت کے مسئلہ خلافت پر تاریخ ساز یگانگت اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ کاش مسئلہ قومیت پر ویسی ہی یگانگت دیکھنے میں آتی۔ ایک ہندو لیڈر کا تحریک خلافت کے خاتمہ پر نوحہ ان لوگوں کے تمسخر کا کافی وشافی جواب ہے جو سمجھتے تھے کہ تحریک خلافت کے لیے جان و مال اور قیل وقال صرف کرنا مسلمانوں کی ایک بھیانک غلطی تھی۔

"مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا کہ جس نے قوم کو بیداری عطا کی ہے......" اور میرے خیال میں یہی بیداری تحریک پاکستان پر منتج ہوئی۔

مکتبہ جمال نے عزم کر رکھا ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ساری تصانیف ایک ایک کر کے زیور طبع سے آراستہ کی جائیں۔ زیر نظر کتاب "مسئلہ خلافت' جزیرۃ العرب" کے پہلے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر افسوس کہ کسی بھی پبلشر نے اسے اس کی اصلی صورت میں شائع نہیں کیا۔

بعضوں نے تو مولانا کی تحریر میں تبدیلیاں بھی کیں جو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شان اور قلمی آن کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ مجھے اس کتاب کا اصل نسخہ تلاشِ بسیار کے بعد محترم پروفیسر افضل حق قرشی صاحب کی ذاتی لائبریری سے ملا۔ انہوں نے کمالِ شفقت سے یہ نسخہ اشاعت کی غرض سے عطا کیا اور اس سلسلے میں اپنی علمی رہنمائی اور سرپرستی سے بھی مستفید کیا۔

آخر میں محترم پروفیسر افضل حق قرشی صاحب کا بالخصوص اور محترم دوست اصغر نیازی صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی رہنمائی اور علمی تعاون سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

میاں مختار احمد کھٹانہ

۱ تحریک خلافت' قاضی محمد عدیل عباسی' ص 254۔

نوٹ:۔

پہلے ایڈیشن میں جو اغلاط رہ گئی تھیں، حالیہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اب بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرما دیں تا کہ آئندہ اشاعت میں اس کی بھی تصحیح کی جا سکے۔

پیش لفظ

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات وہ عظیم الشان تحریکیں تھیں جنہوں نے برعظیم پاک و ہند میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور اس کی آزادی کو ممکن بنایا۔ ان تحریکوں کے جلیل القدر رہنماؤں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء)' مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۸۷۸-۱۹۲۶ء)' مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۱ء)' مولانا شوکت علی (۱۸۷۳-۱۹۳۸ء) اور مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ذات میں ایک بلند پایہ صحافی' بے مثال خطیب' عدیم النظیر نثر نگار' معاملہ فہم مدبر اور ایک عالی مرتبت عالم دین کی ہستیاں سمٹ آئی تھیں۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جس کی ہر جہت درخشاں اور تابناک تھی۔ سید سلیمان ندوی انہیں ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸)' ابن قیم (۱۲۹۲-۱۳۵۰)' شمس الائمہ سرخسی (۱۰۰۹/۱۰۱۰-۱۰۹۰) اور امیہ بن عبدالعزیز اندلسی (۱۰۶۸-۱۱۳۵) کے ہم پلہ سمجھتے ہیں اور ان کے بقول ''نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلامؒ کے الہلال والبلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت' کمال انشاء پردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا' اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔''

مولانا کی سیاسی زندگی میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء نہایت اہم سال تھے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رانچی سے رہائی کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء تک جب انہیں کلکتہ میں پھر گرفتار کیا گیا آپ ملک بھر میں مسلسل دورے کرتے رہے۔ ۲۸-۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو پراونشل خلافت کانفرنس بنگال کے زیر اہتمام اجلاس منعقدہ کلکتہ میں خطبہ صدارت دیا اور لوگوں کو حکومت سے ترک موالات کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خطبہ زبانی تھا

اور اسے ہی بعد میں "مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ تاثر درست نہیں۔ ایک [illegible] خلافت پر مشتمل اس خطبہ کو مئی ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کے شعبہ تبلیغ و اشاعت نے پہلی بار "مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے آغاز میں مولانا محمد اکرم خان آنریری سیکرٹری خلافت کمیٹی بنگال و شعبہ تبلیغ و اشاعت کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ "مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱ تک لکھا تھا۔ بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے بڑھا دیئے تا کہ اس موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے...... جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی۔ چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ وہی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا۔ البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیئے گئے جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔" بعد میں مولانا نے اس پر نظر ثانی کی اور مباحث میں اضافہ کیا۔ نیز دو ضمیمے شامل کیے۔ یہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن مولانا کے مقدمے کے ساتھ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں مرزا فضل الدین احمد نے کلکتہ سے شائع کیا۔ اب اس کی ضخامت دو سو پینتیس صفحات تک بڑھ گئی۔ کسی ایک موضوع پر یہ مولانا کی طویل ترین تحریر ہے۔ تحریک خلافت میں تمام افکار کا سرچشمہ بھی ایک تحریر تھی۔ اس کے مطالعے سے قرآن، حدیث اور تاریخ اسلام پر مولانا کے علم و نظر کی گہرائی اور گیرائی کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول اردو، عربی، فارسی، انگریزی کسی زبان میں اس کی مثال موجود نہیں۔

اشاعت دوم سے اب تک برعظیم پاک و ہند میں اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کسی بھی ناشر نے اسے اس کی اصل اور مکمل صورت میں شائع نہیں کیا۔ عزیزی میاں مختار احمد کھٹانہ ستائش کے مستحق ہیں کہ وہ مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے اور کمپیوٹر پر کمپوز کروا کے اب اسے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے ابوالکلامؒ شناسی میں یہ ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔

پروفیسر افضل حق قرشی
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مقدمہ

﴿طبع ثانی﴾

الحمد للہ وحدہ۔ چار مہینے ہوئے' یہ رسالہ خطبۂ صدارت کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اب مزید تہذیب و ترتیب اور اضافۂ فصول و مطالب کے ساتھ بار دوم شائع کیا جاتا ہے۔

پہلے ایڈیشن سے تقریباً ایک ثلث مطالب اس میں زیادہ ہیں۔ وہ تقریر کی شکل میں تھا۔ اس لیے ابواب و فصول منضبط نہ تھے۔ اب یہ کمی پوری کر دی گئی ہے۔

اس ایڈیشن کے حسب ذیل اضافات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

(۱) آیۂ کریمہ **اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم** میں تحقیق معنیٰ "اولی الامر" جس کی طرف پہلے سرسری اشارہ کیا گیا تھا۔

(۲) شرح حدیث حارث اشعری مندرجہ مسند و ترمذی' اور نظام و قوام جماعت۔

(۳) اشتراط قرشیۃ کا مبحث اب بالکل مکمل و ختم کر دیا گیا ہے۔ حتی الوسع مسئلہ کا کوئی ضروری پہلو بحث و نظر سے باقی نہیں رہا۔ پہلے ایڈیشن میں حدیث الائمۃ قریش کے بعض طرق و سلاسل غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیئے' تھے' لیکن اب ان پر بھی نظر ڈال لی ہے' تا کہ بحث بالکل مکمل ہو جائے۔ دعوائے اجماع پر بھی بعض نئے مباحث ملیں گے جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے۔ امید ہے کہ اصحاب نظر و بصیرۃ کے لیے یہ حصہ خاص طور پر موجب انشراح خاطر' و رفع اضطراب' و دفع شکوک و ارتیاب ہوگا۔

(۴) مسئلہ "حمل سلاح علی المسلم" کی طرف پہلے سرسری طور پر اشارہ کر دیا تھا۔ اب ایک مستقل باب بڑھا دیا ہے' اور اصولی طور پر مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب صاف ہو گئے ہیں۔

(۵) حکم دفاع کا حصہ بھی پہلے سے زیادہ مشرح و مکمل ہے۔

مسئلہ خلافت تاریخ اسلام کے ان نہایت نازک اور مزلہ اقدام مسائل میں سے ہے جو میدان

تقاتل و تزاحم سے کہیں زیادہ صفحات کتب اور مجالسِ بحث و نظر میں معرکتہ الآراء رہ چکے ہیں اور بعض اندرونی فرق و طوائف کی نزاعات اور مختلف عہدوں کے پولیٹیکل اثرات کی آمیزش و احاطہ نے مسئلہ کی صاف و سہل الفہم صورت کو طرح طرح کی مشکلوں اور پیچیدگیوں سے غبار آلود کر دیا ہے۔ علی الخصوص نصوص سنت کی تشریح' بے شمار اور بظاہر مختلف احادیث کی تطبیق و توفیق' ان کے فقہ و حکم کی معرفت و تحقیق' اور ہر حکم کو اس کے صحیح محل پر وارد و محمول کر دینے کا معاملہ نہایت غور و فکر اور وسعت نظر و رسوخ علم کا محتاج ہے۔ فکر کی ذرا سی لغزش اور نظر کی تھوڑی سی کوتاہی بھی نہایت سخت غلطیوں کا موجب ہو جا سکتی ہے۔

بایں ہمہ مسئلہ کی تمام مشکلات جس طرح حل ہوگئی ہیں اور ضمناً جابجا متعدد اصولی مسائل و مباحث کی نزاعات قدیمہ کا جس طرح بکلی خاتمہ کر دیا گیا ہے' اس کا اندازہ صرف وہی اصحاب علم و بصیرت کر سکتے ہیں جن کو بحث و نظر کی ان وادیوں میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے' اور جو ان مسائل کو ان کے اصلی مصادر و موارد اور متداول کتب قوم میں دیکھ چکے ہیں اور مشکلات کار کے اندازہ شناس ہیں۔ وقلیل ماھم۔

معہذا اختصار مانع تشریح و تفصیل رہا اور اکثر مقامات میں اس طرح اشارات کرنے پڑے' گویا مخاطبین کی نظر و معلومات بطور مقدمہ کے فرض کرلی ہیں۔ بدقسمتی سے یہ مقدمہ محل نظر ہے' مگر بغیر اس کے چارہ بھی نہ تھا۔ افسوس کہ ان مباحث کی نسبت خود مدعیانِ علم پر بھی عام طور پر واعظانہ و خطیبانہ رنگ غالب ہے۔ نظر و تحقیق سے ذوق رکھنے والے ناپید ہیں۔ اور ہمارے حصہ میں ایک ایسا عہد آیا ہے کہ اگر اس سے بھی زیادہ خیرہ مذاقی و کم نظری کا ماتم پیش آجائے تو گلہ مند نہ ہونا چاہیے:

کم اردنا ذاک الزمان بمدح

فشغلنا بذم ھذ الزمان!

البتہ اس رسالہ کے طبع اول کی اشاعت سے مسئلہ کے تسلیم و اعتراف کا جو اقبال عام طور پر ظہور میں آیا' علی الخصوص طبقہ علماء کرام میں۔ اس کے لیے توفیق الٰہی کا شکر گذار ہوں۔ بے شمار اصحاب نے جن میں ایک بڑی تعداد علماء کی ہے' مؤلف کو مطلع کیا ہے کہ مسئلہ خلافت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات عارض تھے' مگر اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہوگئے۔ واللہ یھدی من یشاء الی سواء السبیل۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مولف نے گذشتہ فروری کے اجلاس خلافت کانفرنس بنگال میں جب اس رسالہ کے مطالب پر تقریر کی' تو بیان کیا تھا کہ اگر موجودہ حالات میں تبدیلی نہ ہوئی تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ اس حکم شرعی پر عمل پیرا ہو جائیں جس کو مولف "ترک موالات" کے نام

سے موسوم کرتا ہے۔ پھراس کی تشریح بھی کر دی تھی اور بتلایا تھا کہ از روئے نصِ قرآنی مسلمانوں کا اولین عمل فریق محارب کے مقابلے میں یہی ہونا چاہیے۔

اگر چہ اس وقت بجز مہاتما گاندھی جی کے تمام ارباب کار نے اس مسئلہ سے سرد مہری برتی اور طرح طرح کے عذرات پیش ہوتے رہے' تاہم حکم قرآنی کی الہامی و ربانی صداقت بالآخر فتح یاب ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام اصحاب کار کو طوعاً و کرھاً اس پر متفق ہو جانا پڑا:

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اب ملک کی سیاسی جماعتیں بھی اس اعتراف میں ہمارے ساتھ شریک ہیں اور یقین کرتی ہیں کہ ملک کی نجات کے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہیں۔ یہ یقیناً کار فرمائے غیب ہی کی کارسازی ہے کہ اس نے ملک کی ایک راست باز غیر مسلم ہستی یعنی مہاتما گاندھی جی کے صداقت اندیش دل کو بھی خود بخود اس حقیقت کے علم و فہم کے لیے کھول دیا اور انہوں نے بھی چارۂ کار دیکھا تو وہی تھا جو تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کو بتلا دیا گیا ہے۔

۲۰- جنوری سنہ ۲۰۔ کو جب دہلی میں خلافت ڈیپوٹیشن کی ایک صحبت مشورۃ منعقد ہوئی اور سب سے پہلی مرتبہ "نان کوآپریشن" کی تجویز بحث میں آئی' تو اس وقت صرف مسٹر گاندھی اور مؤلف رسالہ ہی کے دل و زبان پر تھی۔ باقی یا متردد تھے یا مخالف۔ لیکن الحمدللہ کہ آج ملک کے تمام مسلم و غیر مسلم ارباب عمل و صفا کا متفقہ اعلان یہی ہے!

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس رسالہ میں مسلمانان ہند کے فرائض و اعمال کی نسبت جو کچھ بصیغہ استقبال لکھا گیا تھا' وہ اشاعت کے بعد حال کے حکم میں آ گیا ہے۔ موجودہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر کیا کیا فرائض عائد ہو جائیں گے؟ بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ عائد ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال جستجوئے احکام کا نہیں ہے ادائے فرض کا درپیش ہے۔ رسالہ کے آخری ابواب میں مختصراً اس طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ تفصیل دوسرے حصہ میں ملے گی جو "ترک موالات" کے نام سے (مع مفصل طریق عمل و ترتیب کار) خلافت کمیٹی کی جانب سے شائع ہونے والا ہے اور جس کو آج کل قلمبند کر رہا ہوں۔ فان اعش' فما بینها لکم' و ان امت' فما انا بصحبتکم بحریص۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

۹- محرم سنہ ۱۳۳۹
(پنجاب میل اسٹیشن کانپور)

احمد
کان اللہ لہ

مقدمہ

(طبع اوّل)

مسئلہ خلافت و بلاد مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے مطالبات کی تمام تر بنیاد احکام شرعیہ پر ہے۔ اس لیے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ ایک مبسوط تحریر اس موضوع پر شائع کی جاتی' جس میں تمام احکام شرعیہ کی پوری طرح شرح و تحقیق ہوتی اور جس قدر شبہات اس بارے میں پیدا ہو سکتے ہیں' ان سب کا کماحقہ ازالہ کر دیا جاتا۔

یہ رسالہ اسی غرض سے شائع کیا جاتا ہے۔

۲۸-۲۹-فروری سنہ ۲۰ کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے لیے مولانا ابوالکلام نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱-تک لکھا تھا۔ بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے بڑھا دیئے تاکہ اس موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے۔ جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی اور اسی کے ضمن میں احکام و دلائل کا خلاصہ بھی آ گیا تھا۔ چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ وہی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا۔ البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیئے گئے' جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور دنیا کا مستقبل عالمگیر امن۔ تاکہ یہ رسالہ صرف احکام شرعیہ کی بحث و تحقیق کے لیے خاص ہو جائے اور ان مباحث کو علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے۔

اس رسالہ کی اشاعت سے تبلیغ و اشاعت کا پہلا کام انجام پا گیا۔ یعنی مسئلہ پر شرح وبسط کے ساتھ ایک مکمل بحث ہو گئی جس کا خطاب زیادہ تر حضرات علماء سے ہے۔

نیز ایک ایسا جامع رسالہ تیار ہو گیا' جس میں مسئلہ کا تمام ضروری مواد موجود ہے۔ اب جو ارباب قلم اور کارکنان مجالس خلافت تبلیغ و اشاعت کے لیے مضامین شائع کرنا چاہیں' وہ اس مواد کو پیش نظر رکھ کر مختلف پیرایوں اور شکلوں میں متعدد رسالے مرتب کر لے سکتے ہیں۔

کلکتہ
مئی سنہ ۱۹۲۰ء

محمد اکرم خان
آنریری سیکرٹری خلافت کمیٹی' بنگال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ ونتوکل علیہ. ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا. من یھدی اللہ فلا مضل لہ' ومن یضللہ فلا ھادی لہ. و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ. و نشھد ان سیدنا محمدعبدہ و رسولہ. صلی اللہ علیہ وعلی الہ و اصحابہ وسلم۔

برادران و بزرگان ملک وملت!

آپ کے صوبے کی یہ پہلی خلافت کانفرنس ہے جس کی صدارت کی عزت مجھے دی گئی ہے۔ آپ کی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس بات سے واقف ہوگا کہ اس قسم کی رئیسانہ اور رسمی حیثیت کا اختیار کرنا میری زندگی میں سب سے پہلا واقعہ ہے اور اس طریق عمل سے مجھے روگردان و منحرف ثابت کرتا ہے جس پر نہایت اصرار کے ساتھ قائم رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا' مجھے موقعہ ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک ''مذہب عمل'' قرار دے لوں۔ خدمت ملک وملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ ومنزل کے سارے مرحلوں پر غور کرلیا ہو۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔ اس وقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کرلیا تھا' ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت' انجمنوں کے عہدوں اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصوبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں گا۔

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی' وہ دعوۃ وتبلیغ کی راہ تھی۔ موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے اتباع واقتداء کے لیے نوع انسانی کے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں

کے نام سے پکارے گئے ہیں اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں ''حکمت'' اور ''سنتہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد (علیہما الصلوۃ والسلام) کے رہنما ہاتھوں میں دے دینے کے لیے مضطر تھا۔ گریبالڈی، میزینی یا گلیڈ اسٹن اور پارنل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشہ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا' یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار۔ لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوۃ و مذاہب کا ایک دلدادہ' انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریسیڈنٹ ہو۔ خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوۃ اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت' ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے۔

حضرات! مذہب عمل کے اس بنیادی اعتقاد نے میرے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دیں۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا۔ یہ مدنیت زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے' میرے لیے ہمیشہ سمندر رہی یا ایک صحرائے ریگ زار' لیکن کبھی ایک آبادی اور بستی کا اس نے کام نہیں دیا اور نہ کبھی میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں۔ تاہم آپ حضرات کے لیے یہ عرض کرنا ضروری نہیں ہے کہ جہاں تک ایک ناچیز انسانی ہستی ارادہ کے ساتھ عمل کو جمع کر سکتی ہے' میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کے لیے ہمیشہ سخت رہا ہوں اور موجودہ زمانے کی لیڈر شپ کی دلفریب سے دلفریب نمائشیں اور ابنائے عصر کی رفاقت و معیت کی صبر آزما دلچسپیاں بھی اس بارے میں میرے لیے موثر نہیں ہوئی ہیں۔

اسی بنا پر جب آپ کے لائق اور سرگرم سیکرٹری کا تار مجھے بنارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت تم کو منظور کر لینی چاہیے۔ تو میں نے اداء تشکر و امتنان کے بعد اپنے آپ کو اس سے معذور ظاہر کیا۔

لیکن جب میں کلکتہ پہنچا اور اس بارے میں زبانی گفتگو ہوئی تو کچھ عرصہ کی ردوکد کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ یقیناً اپنے دستور العمل سے ایک کھلا انحراف ہے' لیکن آپ یقین کیجیے کہ اس انحراف کے لیے جس چیز نے مجھے مجبور کیا، اس کی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ ضروری تھی۔ اصول مقاصد کے لیے ہیں۔ مقاصد اصول کے لیے نہیں ہیں۔ پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر بڑی چیز کے لیے چھوٹی چیز کو اور ہمیشہ مقاصد کے لیے وسائل کو قربان کر دینا چاہیے' میں تیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے ایک وسیلے یعنی اپنے

طریقِ عمل کو خیر باد کہہ دوں اور اس مجلس کی صدارت منظور کرنے سے انکار نہ کروں۔

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ وہ اصلی سبب بھی عرض کر دوں جس نے مجھے یکا یک اپنے طریقِ عمل کے برخلاف اس بات کے لیے آمادہ کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے نظر بندی کے گوشہ قید و عزلت سے نکلے ہوئے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس تھوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کر لیا ہے کہ موجودہ اسلامی و ملکی مسائل کی نسبت کام کرنے والوں کے طریقِ عمل کا کیا حال ہے؟ مجھے صاف صاف عرض کر دینا پڑتا ہے کہ ملک کے کارفرما طبقہ کی نسبت اب سے سات سال پہلے جو رائیں میں نے قائم کی تھیں اور جن کی وجہ سے بسا اوقات نہایت قیمتی اور محبوب رفاقتوں سے بھی دست بردار ہو جانا پڑتا تھا' بدقسمتی سے اب تک ان میں تبدیلی کا وقت نہیں آیا ہے۔

متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جس کو اپنے چاروں طرف پاتا ہوں۔ ایک طرف ملک کی عام پبلک ہے اور سورج کی روشنی کی طرح بالکل یقینی صورت میں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ کسی صحیح راہِ عمل پر چل کھڑے ہونے کے لیے منتظر و مستعد ہے۔ دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں' اس پر اب تک وہی تذبذب و اضطراب اور تزلزل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور وسائل میں انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت بینی اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے۔ زبانوں کی لکنت گو دور ہو چکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا لیکن دلوں کی دہشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک روحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ زبانیں جس قدر تیز ہیں' قدم میں اتنی تیزی نہیں ہے اور اعلان جس قدر بلند آہنگی اور رعد آسائی رکھتا ہے' عمل میں اس قدر بلند پیمائی نظر نہیں آتی۔ نیند گو ٹوٹ چکی اور شاید خفتگانِ بسترِ غفلت کروٹیں بھی بدل چکے' لیکن آنکھوں میں خمار بدستور باقی ہے اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان ناآشنا نہیں رہی' لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا ڈر اور ایمان کے ساتھ نفس کا عشق بھی باقی ہے:
وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذَالِكَ سَبِيْلًا (۴:۱۵۰) اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں راہوں کے بین بین کوئی تیسری راہ اختیار کریں۔ حالانکہ تیسری راہ اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں۔ راہیں صرف دو ہی ہیں۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸:۲۹). حضرت مسیح نے کہا ہے: "ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا" قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے: مَاجَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِىْ جَوْفِهٖ

(۴:۳۳) یعنی:

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

حضرات! مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے اگر میں حقیقت کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھنا چاہوں۔ افسوس کہ وقت کی جلدی اور قانون قدرت کی بے صبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنی ازلی بے پروائی کے ساتھ نتائج وعواقب کی آخری منزل تک بڑھتا چلا آیا ہے۔ اب موت وحیات' بقاء وفنا' ایمان وکفر اور خدا اور ماسوائے اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے اور اس لیے میں قابل ملامت نہیں ہوں اگر حسن بیان اور بلاغت اظہار کے پر پیچ آداب وقواعد کو موت وحیات کی کشمکش میں سنبھال نہیں سکتا۔ یہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کرلیا کہ اگر مجھ کو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقعہ ملتا ہے تو میں اس سے انکار نہ کروں اور اگر صدارت کے حقوق واختیارات کو اصل مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہوں تو اس کو ایک مفید فرصت تصور کروں۔ شاید اس طرح اس صحیح راہ عمل کی طرف کوئی قدم اٹھ سکے جس کو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا ہے اور آج بھی جبکہ اس اعراض کے نتائج سامنے ہیں' تذبذب واضطراب عمل' عزم وایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے۔

حضرات! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آپ نے اپنی محبت اور مہربانی سے جو عزت مجھے دینی چاہی ہے' اس سے گریز نہ کروں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ کی دلی رفاقت واعانت کا طلبگار۔ ہم سب کو اللہ کے فضل وتوفیق پر اعتماد ہے جس کے بغیر کائنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پا سکتا۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے!

وما توفیقی الا باللہ. علیه توکلت والیه انیب۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

خلافت

''خلافت'' عربی کا ایک مصدر ہے۔ اس کا مادہ ہے ''خلف'' اور اسی سے ہے ''خلیفہ''۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔ من قولک خلف فلان فلانا فی هذاالامر اذا قام مقامه فیه بعده (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد اس کا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی، اور لغت میں اس کو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہیں گے، خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو یا غیبت کی وجہ سے، یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے۔ مفردات امام راغب میں ہے۔'' الخلافة، النیابة عن الغیر، اما بالغیبة المنوب عنه، واما لموته، واما لعجزه واما لتشریف المستخلف'' (صفحہ ۱۵۵)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے۔ یعنی عربی زبان کے ان لفظوں میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرع معنی کے لیے اختیار کر لیا جیسے ایمان غیب، تقدیر، بعث، صلوۃ وغیرہ ذٰلک۔ ایمان کے لغوی معنی یقین وطمانیت اور زوال خوف وشک کے تھے، لیکن قرآن حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین واقرار اور عمل کے لیے استعمال کیا اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور ''استخلاف فی الارض'' اور وراثت وتمکن فی الارض سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت وسلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافتِ ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار قوم وحکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم وجور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے، ایک عام امن وسکون اور راحت وطمانیت دنیا میں پھیل جائے اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانونِ عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک نافذ وقائم ہے اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے

چپے میں جاری وساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت وانسیت کی ایک بہشت زار بنادے!

لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس لیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی اور ہر خلیفہ، سابق کا قائم مقام۔ ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفۃ اللہ صاحب شریعت وشارع اسلام تھا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی وہ اس خلیفۃ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے، اس لیے ان پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔

یہ زمین کی وراثت وخلافت یکے بعد دیگر مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گزار رہے۔ آیات ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (٦: ١٦٥)

وہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین میں خلافت دی۔

وَ يَسْتَخْلِفُ رَبِّىْ قَوْماً غَيْرَكُمْ(١١ : ٥٧)

اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو میرا پروردگار تمہاری جگہ خلافت کسی دوسری قوم کو دے دے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (١٠:١٤)

پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تا کہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْجَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (٧. ٦٩)

اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (٣٨. ٢٦)

اے داؤد! ہم نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا۔

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ (٢١:١٠٥)

اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں

ہی کی وراثت میں آئے گی۔

یہی چیز زمین کی "تمکین" یعنی طاقت وعظمت کا جماؤ اور قیام بھی ہے جو سرزمین فراعنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی، جبکہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق وصالح کی قوت سے ایک دن مصر کے تاج وتخت کا مالک ہوگیا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ (۱۲:۵۶)

اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر میں قائم کردی۔

اوراسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲:۴۱)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین میں جمادیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے دُنیا کو روکیں گے۔

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ تمکین فی الارض یعنی حکومت کا مقصد اصلی قرآن کریم کے نزدیک کیا ہے؟ معلوم ہوگیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے، نیکی اور راستی کا اعلان وظہور ہو، برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے۔

دوسری آیت میں اس کو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.(۲۴. ۵۵)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سروسامانی کی حالت کے ساتھ دشمنوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتھیار اپنے جسم سے دور نہیں کرسکتے تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا ما یاتی علینا یوم نامن فیہ ونضع عنا الاسلاح.

ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں آیا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح وشام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کرسکتے۔

ابوالعالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے۔ جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا، مظلومی و بیچارگی کی جگہ فرمانروائی و کامرانی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضۂ اقتدار میں آجائے گی۔ (تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۱۲۲)

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز "خلافت" ہے وہ خلافت فی الارض ہے۔ یعنی زمین کی حکومت و تسلط۔ پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اسے حاصل نہ ہو۔ وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔ اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خدا اور رسولؐ کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا۔ ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے اور اس کا مٹانا اس کے ظہور کا پہلا کام تھا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹. ۳۱) اور

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳. ۷۹)

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ آٹھ نو سال بعد جب داعی اسلام دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام جزیرہ عرب مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کے لیے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں۔ اس سلسلۂ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفۃ اللہ خود حضرت داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مقدس تھا اور آپ ﷺ نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ وہ آپؐ کے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔ " **علیکم بسنّتی و سنة الخلفاء الراشدین**" (ابن ماجہ عن العرباض ابن ساریہ)۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفہ رسول اللہ تھے۔

خلافت خاصہ وخلافت ملوکی

آنحضرتؐ کے بعد خلافت اپنے خصائص ونتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہوگئی۔ خود آنحضرتؐ نے نہ صرف ان کی پیشتر سے خبر ہی دے دی تھی، بلکہ تمام علائم وخصائص صاف صاف بیان کردیئے تھے۔ اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں، وہ کثرت طرق، شہرت متن، قبول طبقات کی بنا پر حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلا سلسلہ، خلافت خلفائے راشدین مہدیین کا تھا جن کی خلافت منہاج نبوت پر تھی۔ یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعیت شخص رسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق کار ٹھیک ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا اور اس لیے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزو تھا اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح ان کی شخصیت بھی جامع وحاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد وامر حکومت وفرمانروائی اور قوام ونظام شرع نظام شریعت اور نظام سیاست، یہ تمام قوتیں ان کی ذات واحد میں جمع تھیں۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومت شوریٰ، جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ریپبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہوگیا۔

دوسرا سلسلہ خلافت منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت وپادشاہت کا تھا، جب کہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی وعربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کررہی تھیں۔ یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اقرب تھا، لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہوگئے تھے۔ خلفاء بنوامیہ سے لے کر آج تک جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے، وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلبہ طریق ہدایت ونبوت خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست وشخصیت بادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

"الخلافة بعدی ثلاثون عاماً ثم ملک بعد ذلک" (اخرجه اصحاب السنن)

اور حدیث ابوہریرہ "الخلافة بالمدینة والملک بالشام

ایک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بتلائے گئے ہیں۔ "نبوة ورحمة ثم خلافة ورحمة" وفی لفظ "خلافة علی منهاج النبوة ثم یکون ملک عضوض" (رواه البزار وقال السیوطی حسن) امیر معاویہ نے اسی کی نسبت کہا تھا ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کرلی۔

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے۔ عہد نبوت ورحمت، خلافت ورحمت، پادشاہی وفرمانروائی۔ پہلا دور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ختم ہوگیا۔ دوسرا دور فی الحقیقت عہد نبوت کا ایک تتمہ اور لازمی جز تھا (جیسا کہ سلسلۂ دعوت اور تکمیل کاروبار شرائع میں ہمیشہ سنت اللہ رہی ہے) جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد سے مجرد عہد پادشاہی واستبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں علیحدہ علیحدہ احادیث میں تلائی گئی تھیں اور وہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں۔ نبوت ورحمت کی برکات کی محرومی وفقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا اور بدعات وفتن کے ظہور واحاطہ کی ایک تدریجی ترقی ہوئی۔ کالحصیر عوذا عوذا۔ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوئی اور جس قدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت وخلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ قوام ونظام امت کے مبادیات واساسات سے لے کر حیات شخصی وانفرادی کی اعتقادی وعملی جزئیات تک، ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔ فتن وفساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھی جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابة بالفتن) حضرت عمرؓ کا وجود تھا۔ جونہی یہ بنیان مرصوص ہٹی سیلاب عظیم امنڈا اور پھر کوئی سد وبند اس کی راہ نہ روک سکا۔ اسی سیلاب کو حضرت حذیفہؓ کی روایت میں التی تموج کموج البحر (رواہ بخاری) سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اس کی موجیں اٹھیں کی سو واقعی اٹھیں اور دور خلافت ورحمت اور خلافة علیٰ منہاج النبوة کی عظیم الشان عمارت اس کے تلاطم وطغیان میں آناً فاناً بہہ گئی۔

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول کے خصائص تازہ کردے گا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ "لایدری اولها خیراً ام اخرها" نہیں کہا جاسکتا کہ امت کی ابتدا وزیادہ کامیاب تھی یا اس کا اختتام؟ یہی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہوکر رہے گا کہ۔

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (۹.۶۱)

دین اسلام اور اس کا رسول اس لیے آیا کہ تمام دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہوکر رہے (کیونکہ آخری غلبہ وبقا صرف اصلح کے لیے ہے اور تمام دینوں میں اصلح صرف اسلام ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ایک مومن قلب کے لیے فتح واقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ طلوع صبح کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ ان موعدهم الصبح الیس

الصبح بقریب۔ان کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔کیا صبح کا وقت قریب نہیں آ گیا؟

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
بستن درومن فتح باب می شنوم

عہد اجتماع وائتلاف و دور اشتات وانتشار

آپ آزردہ خاطر نہ ہوں اگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کے لیے مجھے اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کرلے۔ اس مقام کی مزید وضاحت کے لیے بہتر ہوگا کہ دو خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کرلیں۔ ایک ''اجتماع'' و ''ائتلاف'' ہے اور دوسرا ''اشتات'' و ''انتشار'' نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت وحیات، ترقی وتنزل اور سعادت وشقاوت کے جو اصولی اسباب ومراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔'' ''اجتماع'' کے معنی ہیں ضم الشی بتقریب بعضه من بعض (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہوجانا اور ائتلاف ''الف'' سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ماجمع من اجزاء مختلفة ورتب ترتیبا، قدم فیه ماحقه ان یقدم' واخرفیه ماحقه ان یؤخر'' (مفردات۔۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہوجانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔'' عہد اجتماع وائتلاف'' سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب وترتیب کے ساتھ اکٹھی ہوجاتی ہیں اور تمام مواد، قویٰ، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی وانضمامی دور طاری ہوجاتا ہے۔ یہ حد یکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم گر جڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہوجاتا ہے، کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہوکر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع وانضمام پیدا ہوجاتا ہے تو اسی سے تخلیق وتکوین اور وجود ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ ''تخلیق'' و ''تسویہ'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ الذی خلق فسوی (۸۷۔۲) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع وائتلاف اور موت وفنا نہیں ہے مگر اس کی ضد یہی حالت جب افعال واعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو ''خیر'' اور شریعت کی زبان میں ''عمل صالح اور حسنات'' کہتے ہیں۔ جب یہ حالت جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں ''تندرستی'' سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ ''زندگی'' ہے اور پھر یہی حالت ہے جب

قومی وجماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام ''حیات قومی واجتماعی'' ہوتا ہے اور اس کا ظہور قومی اقبال وترقی اور نفوذ وتسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں معنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ وواحد کی ذات کی طرح، اس کا قانون حیات ووجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے ولنعم ماقیل ۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

اس حالت کی ضد ''اشتات وانتشار'' ہے۔ اشتات ''شتت'' سے ہے جس کے معنی لغت میں ''تفریق'' اور الگ الگ ہوجانے کے ہیں۔ "یقال شت جمعهم شعاو شعاتاً وجاوا اشتاتاً. ای متفرقی النظام اشتاتاً (مفردات . ۲۵۶)

قرآن حکیم میں ہے یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتاً (۹۹. ۲) اور مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰. ۵۳) اور وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰی (۵۹. ۱۴) ای مختلفة. انتشار "نشر" سے ہے۔ اس کے معنی بھی الگ الگ ہوجانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورۃ جمعہ میں ہے فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا (۶۲ : ۱۰) یعنی تفرقوا اشتات وانتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع وائتلاف کی جگہ الگ الگ ہوجائے، منتشر اور پراگندہ ہونے، اور باہم گر علیحدگی وبیگانی کی حالت طاری ہوجائے۔ مواد میں، قویٰ میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہوجائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو ''تکوین'' کی جگہ ''فساد'' اور ''وجود'' کی جگہ ''عدم وفنا'' کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے ''بیماری'' اور پھر ''موت'' ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اسی کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح ''عمل سوء'' اور عصیان سے تعبیر کرتا ہے اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہوجاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا ''اجتماع وائتلاف'' کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اس لیے انسان کے لیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت ونعمت قرار دیا ہے اور اس کو ''اعتصام بحبل اللہ'' اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادہ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کرکے اور پھر تمام عرب وعجم سے فرمایا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (۳:۱۰۳)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ سب کے ہاتھ اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے سرفراز کیے گئے۔ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات وانتشار کی زندگی کو بقاء وقیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکت کی ایک آگ ہے جس کے دہکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشو ونما نہیں پا سکتی۔

وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ. (۳: ۱۰۳)

اور تمہارا حال یہ تھا کہ "آگ کے دہکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل ورحمت کی نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر دکھاتا ہے، تاکہ کامیابی کی راہ پالو!

یہ بھی جا بجا بتلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع وائتلاف کی صالح وحقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق ورحمت اور اس کی وحی وتنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (۸: ۶۳)

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت واتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے۔ جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت ونزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع وائتلاف پیدا ہو، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ وانتشار شریعت ووحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور اسی لیے یہ نتیجہ شریعت سے بغی وعدوان اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے۔

فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْعِلْمُ (۱۰. ۹۳)

وَآتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ ۖ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۵. ۱۷)

وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (۳. ۱۰۵)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیۃ" اور "حیات جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا۔ " من فارق الجماعت فمات، میتة الجاهليه" ۔

اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ امیر غیر مستحق ہو نا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے یعنی و مااقامو الصلوۃ اور ساتھ ہی بتلا دیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا۔ یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لیے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہوگئی ہو تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے مسل دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے علیکم بالجماعة فان الشیطان مع الفذه وهو من الاثنين ابعد"

دوسری روایت میں ہے "فان الشیطان مع الواحد" یعنی جماعت سے الگ نہ ہو۔ ہمیشہ جماعت بن کر رہو۔ کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہوگیا دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور رہے گا۔ یعنی اتحادی و جماعتی قوت ان میں پیدا ہوگئی۔ اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔ یہ الفاظ مشہور خطبہ جابیہ کے ہیں جو عبداللہ بن دینار، عامر بن سعد اور سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہے اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی "علیکم بالسواد الاعظم

اور فانه من شذ شذ فی النار

اور یدالله علی الجماعة

اور لایجمع الله امتی علی الضلالته او کما قال

اور خطبہ حضرت امیر کہ وایاکم والفرقه فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب. الامن دعا الی هذاالشعار فاقتلوه ولو کان تحت عمّامتی هذا وغیر ذلک۔

اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہو کر رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانا

دوزخ ہے۔ افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا ہونے نہ دے گا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نااہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا حتیٰ کہ "صلوا خلف کل برو فاجر"، تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی درحقیقت جماعتی زندگی ہے۔ انفراد و فرقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھلائی گئی اس میں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع' حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی،،۔"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ"(۱:۵) فرمایا۔"اھدنی" نہیں کہا گیا یہ اس لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصہ قرآن' وعصارۂ اسلام ہے جمع متکلم کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا سکھائی گئی وہ بھی بصیغہ جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو۔ یعنی "السلام علیکم" "السلام علیک" نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی "السلام علیکم" بصیغہ جمع رکھا گیا واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ علت اس کی بھی یہی ہے نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و ائتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال واندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دے دینا ہے۔ علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفۂ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو، اس کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں

مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔"مثل المومنین فی توادھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد. اذااشتکی منه عضو، تدعی له سائر الجسد بالسھر والحمیٰ (صحیحین)

اور " المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضه بعضا"(بخاری) یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اوراس کے مختلف اعضاء۔ایک عضو میں درد ہوتو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خوداس کے اندر درداٹھ رہا ہواوران کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے پھر تشبیک اصابع کر کے اس کی تصویر بتلادی۔یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلادیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوااور متصل ہے۔توان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کوواضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا ایک جزء ہے اورانہی اجزا کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے۔

اور یادرہے کہ یہ جونماز میں تسویہ صفوف پر سخت زوردیا گیا۔یعنی صف بندی پراورسب کے سروں، سینوں، پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر"لتسون صفوفکم اولیخالفن اللہ بین وجوھکم (بخاری)

اورروایت انس کہ " سوّوا صفوفکم فان تسویة الصفوف من اقامة الصلوة " (بخاری)وفی لفظ " من تمام الصلوة".

تواس میں بھی یہی بھید ہے۔تشریح کا یہ موقع نہیں۔قرآن وسنّت کی تصریحات وحکمیات اس بارے میں اس قدر کثرت سے اورمحتاج تفسیر وکشف ہیں کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب ہے۔"تفسیر البیان" مفصل میں لکھ چکا ہوں۔

جمع وتفرقہ قویٰ ومناصب

اس قانون الٰہی کے مطابق مسلمانوں کی زندگی وعروج کا اصلی دور وہی تھا جب ان کی قومی وانفرادی، مادی ومعنوی، اعتقادی وعملی زندگی پر اجتماع وائتلاف کی رحمت طاری تھی اور ان کے تنزل وادبار کی اصلی بنیاد اس دن پڑی، جب اجتماع وائتلاف کی جگہ اشتات وانتشار کی نحوست چھانی شروع ہوئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا۔ ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی، لیکن بتدریج تفرقہ وانتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا۔ ہر جماؤ پھیلا۔ ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہوگئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون تنزل اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشہ وجود وعمل پر طاری ہوئی اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسباب تنزل امت پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی علتیں ٹھہراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ قرآن وسنت اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات، نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں۔ اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو مگر اصلی علت اس کے سوا کوئی نہیں۔

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی بلکہ ان ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں اور ہر طرح کے نظری وعملی اختیارات وقویٰ کی جو آپؐ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں اور جن کا آپؐ کے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی ودینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستان شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت وجہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین ودنیا دونوں ایک ہی چیز ہے اور شریعت سے حکومت وسلطنت الگ نہیں ہے بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا

شریعت کا مقنن تھا، امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکّہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا ہے۔ غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے اور اسلام کا نظام دینی بھی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

جب آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفاء راشدینؓ کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قویٰ و مناصب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اس کو "منہاج نبوّت" سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوّت کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

منصب نبوّت مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزو وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئولانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے نبوّت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اس کی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵۔۳)

لیکن منصب نبوّت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا اور ضروری تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے لیے "محدث" (بالفتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ مبشرات صادقہ کو نبوّت کا چالیسواں جزء قرار دیا۔ لم یبق الا المبشرات حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدینؓ کو جو نیابت پہنچی، اس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوّت کی نیابت داخل تھی۔ داعی اسلام کا وجود نبوّت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوام سیاست قیادت فوج و حرب، فتح و عمران ممالک، ریاست مجالس شوریٰ وغیرہ، جہانبانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا۔ اس لیے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدینؓ کا تنہا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت و خلافت بھی تھے، صاحب اجتہاد و قضا بھی تھے، اور صاحب سیاست و نظم احکام و بلاد بھی۔ اصلاً "امامت کبریٰ" کا مقام اجتہاد دینی اور

سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔ حضرت عمر مسجد کے دارالشوریٰ میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے۔ عدالت میں مقدمات سنتے تھے اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں احکام بھی وہی بھیجتے، اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی وہی بلاتے۔

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے ان کو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (٦٢-٢) تلاوت آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب و حکمت، خلفاء راشدینؓ ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تزکیہ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے، ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکی بخشتے اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت و سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے وہ ایک ہی وجود میں ابوحنیفہؒ و شافعیؒ بھی تھے اور جنیدؒ اور شبلیؒ بھی نخعیؒ و حمادؒ بھی تھے اور ابن معینؒ و ابن راہویہؒ بھی۔ جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا اور دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں اور اسی لیے ان کا وجود اور ان کے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین** اور اسی لیے **وعضوا علیها بالنواجذ** کے حکم میں نہ صرف سنت عہد نبوت بلکہ خلافت راشدہ خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی اور شرح اس سر الٰہی کی بہت طولانی ہے یہاں محض اشارات مطلوب۔

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دے دی گئی تھی، اجتماع و ائتلاف کی یہ حالت حضرت علی علیہ السّلام پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ ازاں جملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا۔ جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی درہم و برہم کر دیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں ان کا ظہور اور نشو و نما ہوا۔ حکومت و فرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر مجرد پادشاہی کی شکل میں آ گیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا۔ **الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم ملک**"۔ سو واقعی اس کے بعد صرف پادشاہی رہ گئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہا کی ایک الگ جماعت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم و تربیت روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہوگیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی اب

خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لیے اور فقہا کا مجرد استنباط احکام و مسائل کے لیے رہ گیا۔ تو تزکیہ نفوس اور ارشاد قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی، جو بیعت توبہ وارشاد ہوئی اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا وہ پادشاہ، مجتہد، مرشد، قاضی القضاۃ، سپہ سالار جنگ، میر عدل و احتساب سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفقہ کے لیے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضا کے لیے تیسرا، ارشاد و تزکیہ قلوب کے لیے چوتھا و ھلم جرا۔ غرضیکہ عہد اجتماع قوی و مناصب کے بعد دور انتشار قویٰ و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہوگئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں یا اب مختلف وجودوں میں بٹ کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہوگئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو ملت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل وادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سرمست ہو افسوس کہ سطحی جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسباب ترقی و تنزل پر تدبر کرتے!

غرضیکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلہ خلافت قائم ہوا، وہ خواہ قرشی رہا ہو، یا غیر قرشی، مجرد ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے (جیسا کہ عہد حضرت عمر بن عبدالعزیز)۔ یہ دور نیابت نبوت کے اور تمام اجزاء سے یک قلم خالی رہا۔ منصب بٹ چکے تھے۔ قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہوگئی، سو بلاشبہ خلافت راشدہؓ کی طرف عود و رجعت کا یہ ایک مبارک قدم تھا جس کے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص ہر دور اور ہر سلسلے کے وہی رہے جو ایک جامع لفظ ''ملک عضوض'' میں بتلا دیے گئے تھے اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائیدار تبدیلی نہ ہوئی۔

اطاعت خلیفہ والتزام جماعت

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفۂ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر جب تک وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قوام ہستی کی زنجیر فطرت کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت وسنت ایک خاص نظام پر کارفرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی قدرت نے خلقت ونظام خلقت کے بقاوقیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بہ منزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرے کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرے کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہوجائیں یا مرکز کی اطاعت وانقیاد سے باہر ہوجائیں تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہوجائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم وباقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا "**الحقیقہ کالکرہ**" اور صاحب فتوحات نے کہا۔ "دائرہ قاب قوسین ہے۔"

یہ قانون مرکزیت ودوائر نظام ہستی کے ہر جزو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے، ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم کیا ہے، کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیت پر متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں۔ ہر دائرہ کا نقطہ حیات وبقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کررہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت وانقیاد پر موقوف ہے۔ **ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ**.(۳۶:۳۸) خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب وروز اپنے مرکز کے طواف وانقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف ودوران کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ سب یہ حکم **وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**(۳.۸۳) اور **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ** (۲۲:۱۸)

خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق سب اپنی اپنی جگہوں میں کام کررہے ہیں۔

لَاالشَّمْسُ يَنْبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ط وَكُلٌّ فِی فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ(۳۶:۴۰)

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئیں گے اور حرکت وحیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو، اس کی ایک مجتمع وحدت کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت وفنا اس پر طاری ہوگئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کے لیے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری وباطنی اعضاء سے مرکب ہے؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ **اذا صلحت، صلحت الجسد کلہ' واذا فسدت' فسدت الجسد کلہ. الا' وھی القلب!"**

اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اگر نوع انسانی کی سعادت وارتقاء کے لیے قانون اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانون حیات بنایا تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزو نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی۔ پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام واشیا کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت وافراد کی جسمانی ومعنوی بقا بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز ومحور سورج کا وجود ہے اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے۔ پس ان کی اطاعت وانقیاد بقا وحیات کے لیے ناگزیر ٹھہری: **وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ(۴:۶۴)**

دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور اسی لیے فرمایا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا(۴:۶۵)

اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳:۲۱)

پھر قوم وملت کے بقاء کے لیے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیئے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَايَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴:۴۸)

عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے "فمن اقامها اقام الدين ومن تركها فقد هدم الدين" اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ "كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لايرون شيئاً من الاعمال تركه كفر غير الصلوة (ترمذی)

یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو۔ اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ "(۵:۹۷) قِيٰمًا لِّلنَّاسِ پر غور کرو اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا اس لیے تمام دائرہ کا رخ بھی اسی طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲:۱۵۰)

پھر جس طرح شخصی واعتقادی اور عملی زندگی کے لیے مراکز قرار پائے ضروری تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہٰذا وہ مرکز بھی قرار دے دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت، اس کی حرکت پر حرکت، اس کے سکون پر سکون۔ اس کی طلب پر لبیک، اس کی دعوت پر انفاق جان و مال، ہر مسلمان کے لیے فرض کر دیا گیا ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آ سکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام "خلیفہ" اور امام ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی کتاب وسنت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت واعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴:۵۹)

(مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اس کے رسول کی اور تم میں جو اولی الامر ہو اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی

طرف لوٹو اور اس کے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ۔)

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولی الامر ہو، اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولی الامر، تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ ''اولی الامر'' سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظام امت قائم رکھنے والا اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے۔

اولاً، بہ حکم القرآن یفسر بعضہ بعضا اولوالامر کی تفسیر خود قران ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے۔ اسی سورت میں آگے چل کر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔

وَاِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَا عُوْا بِهٖ ط وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط (۴۔ ۸۳)

اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر ان تک پہنچتی ہے تو بلا سوچے سمجھے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو ان میں اولی الامر ہیں، تو فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا پتہ لگا لیتے۔

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جب امن و خوف یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں اور بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب و غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی وجہ سے عہد نبوی میں بھی پیش آ جاتی تھیں۔ پس فرمایا کہ جب کوئی افواہ سنو تو پہلے اللہ کے رسول اور اپنے ''اولی الامر'' تک پہنچاؤ تا کہ وہ اس کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کریں اور خبر کی نوعیت اور راویوں کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج استنباط کریں۔ ایسا نہ کرو کہ جہاں کوئی افواہ سنی، فوراً اس پر یقین کر لیا اور لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

اب غور کرنا چاہیے کہ اس آیت میں ''اولی الامر'' سے مقصود کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ذکر امن و خوف کے حالات کا ہے یعنی صلح و جنگ اور فتح و شکست کا ان حالات کا تعلق صرف حکام و امراء ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ علماء و فقہاء سے نہیں ہو سکتا۔ معاملہ نظمِ ملک و قیامِ امن کا ہے۔ استنباط مسائل اور حلال و حرام کا نہیں ہے پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اولی الامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپرد ملک کا انتظام اور جنگ و امن کا نظم و نسق ہوتا ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ جن کا اثر ملک کے امن و خوف پر پڑ سکتا ہے یعنی ارباب حکومت و امارت۔

ثانیاً، کتاب و سنت اور صدر اول کے آثار عربیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ

''امر'' جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے جیسی کہ یہاں ہے تو اس کا اطلاق عموماً حکومت وسطنت ہی کے معنوں پر ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے موجود ہے کہ ایک صاحب نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ ''امر'' کے معنی حکم کے ہیں اور اولی الامر کے معنی امام بخاری نے ذوی الامر کے کیے ہیں۔ یعنی ''حکم والا'' اور معلوم ہے کہ صاحب حکم وہی ہوسکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

ثالثاً احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت اتری، وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے۔

عن ابن عباس نزلت فی عبدالله بن حذافه بن قیس ابن عدی اذ بعثه النبی صلی الله علیه وسلم فی سریة"

اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کے باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا ان کے حکم کے ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا تھا۔ ''**نزلت فی قصة جرت لعمار مع خالد اوکان خالدا امیراً فاجارعمار رجلا بغیر امره فتخاصما** . دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت وعدم اطاعت کا تھا نہ کہ احکام ومسائل کے حکم وافتاء کا۔

رابعاً اکثر اقوال مرویۂ صحابہ وتابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے بلکہ صدر اول میں صرف یہی تفسیر مشہور ومعلوم تھی۔ بہت سی موشگافیاں جو پیدا کی گئی ہیں، سب بعد کے مفسرین کی طبع زاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے۔ **سالت زید بن اسلم عنها ولم یکن بالمدینة احد یفسر القرآن بعد محمّد بن کعب مثله. فقال اقرا ماقبلها تعرف فقرات. ان الله یامر ان توذو الا مانات الی اهلها واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل. فقال هذه فی الولاة"** (فتح ۱۳:۹۹)

یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا۔ میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ اس آیت سے ماقبل آیت پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ ''**اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُم اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ**'' (۴:۵۸)

پس کہا کہ مقصود اس سے حکام ہیں یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت وقضا کا ہو رہا ہے پس اولی الامر سے مقصود وہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہ

اور میمون بن مہران وغیرہ سے نقل کیا ہے "هم الامراء" اور علامہ ابن حزم نے جب ان تمام صحابہ اور تابعین کو شمار کیا ہے جن سے یہ تفسیر منقول ہے تو وہ ۱۳ سے زیادہ ثابت ہوئے۔ باقی رہا بعض صحابہ اور تابعین کا کہنا کہ مقصود اہل علم ونظر ہیں مثلاً جابر بن عبداللہ کا قول کہ "هم اهل العلم و الخير" اور مجاہد وعطاء وابوالعالیہ کا قول ہے کہ هم العلماء تو ان اقوال میں اور صحابہ کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دراصل اسلام کا نظام حکومت وجماعت تو یہی تھا کہ حکومت وولایت کا منصب تمام شرعی وعلمی قوتوں سے مرکب ہو اور اس وقت تک قوتوں کے انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں۔ جو شخص والی ملک اور حاکم مسلمین ہوتا تھا وہ بدرجہ اُولی عالم وفقیہ بھی ہوتا تھا۔ پس جن صحابہ وتابعین نے "اولی الامر" کی تفسیر میں علم وخیر کا ذکر کیا، انہوں نے واقعی بہت صحیح تفسیر کی۔ گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولی الامر ایسے ہی افراد کو ہونا چاہیے جو اہل علم وخیر ہوں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولی الامر سے مقصود علماء وفقہا کا وہ مخصوص ومتعارف گروہ ہے جو اسلام کے نظام جماعت کے انقراض کے بعد پیدا ہوا اور جس کا صدر اول کے مفسرین کو وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا؟

امام ابن جریر نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے "ابوبکر وعمرؓ"۔ اس سے بھی ان کا مقصود یہی ہے کہ اولی الامر مسلمانوں کا خلیفہ وامام ہے جیسے ابوبکر وعمر۔ رضی اللہ عنہما۔

اصل یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے حجاز میں ایک طرح کی باقاعدہ طوائف الملوکی قائم تھی اور مکہ میں قریش کا قبیلہ بالکل خودمختار اور غیر مسئول تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو اس نے "جماعت" اور "امارت" کے نظام پر زور دیا اور بڑے بڑے گردن کشوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اطاعت امیر والتزام جماعت سے باہر نہ ہوں۔ قریش کی نسلی فطرت اس اطاعت کیشی کے خلاف تھی، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کو اس بات کا خوگر بنانا تھا۔ حافظ عسقلانی نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے۔" ورجح الشافعي الاول واحتج بان قريشا كانوا لايعرفون الا مارة ولاينقادون الى امير، فامروا بالطاعة لمن اولي الامر، ولذالك قال صلى الله عليه وسلم من اطاع اميري فقد اطاعني."

(فتح. ۸. ۱۹۱)

خامساً۔ تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ یعنی امام بخاریؒ کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں باب باندھا۔ اطيعوا الله والرسول واولي الامر منكم

اور اس میں حضرت ابوہریرہ کی روایت درج کی ہے۔

"من اطاع اميرى فقد اطاعني الخ

جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ جس نے اس سے انکار کیا

اس نے خود مجھ سے انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک اولی الامر کی اطاعت سے مقصود میر و امام ہی کی اطاعت ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں۔ **"فی هذا اشارة من المصنف الی ترجیح القول الصائر الی ان الآیة نزلت فی طاعة الامراء، خلافاً لمن قال نزلت فی العلماء.**

(فتح ۱۳۔۹۹)

سادساً۔ سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ و نظر معلوم، انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کر کے ترجیح اسی تفسیر کو دی ہے۔

سابعاً۔ اس نکتہ پر نظر رہنی چاہیے کہ تفسیر قرآن کے معاملہ میں جس قدر اختلافات کی کثرت اور مذہب و فرق کا تعدد و تنوع نظر آتا ہے، وہ تمام تر متاخرین کی فلسفیانہ کاوش پسندی کا نتیجہ ہے۔ جب معقولات کے شیوع اور یونانیت کے غلبہ و احاطہ سے علوم دینیہ میں اس تعمق کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں ان کی نسبت کہا گیا تھا کہ **"هلک المتعمقون"**۔ فکر و نظر میں عجمیت کے ظہور، عربیت خالصہ و صالحہ کے بُعد اور علوم سنت کے ترک و ہجر نے اس معاملے کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اوائل و سلف میں یہ تمام اختلافات یک قلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور ہر لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے جو عربی لغت و محاورہ میں ہو سکتے ہیں اور لوگ اس پر قانع تھے۔ ابداع معانی کثیرہ اور تفحص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کاوش ہی نہیں کی جاتی تھی نہ فرضی تخمینی شکوک و ایرادات گھڑ کر نئے نئے معانی فرض کیے جاتے تھے۔ **"اولی الامر"** کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائے گا جس کی عربیت خالص و صحیح ہو تو صرف ایک ہی معنی اس کے ذہن میں آئیں گے۔ یعنی صاحب حکومت کسی دوسرے مفہوم کا اسے وہم بھی نہیں گزرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ امکانی مطالب کا وسیع سے وسیع میدان ڈھونڈتے ہیں اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کے لیے اختیار کر لینا چاہتے ہیں۔ پس متاخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو اور لغت و عربیت اس کی تصدیق کرے۔ متاخرین کی کاوشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تفنن ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے لیکن وہ تفسیر قرآن بہر حال نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو خود حاملِ قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو اور ان لوگوں نے بتلائی ہو جن کے علم و عمل پر خود اللہ نے اپنی رضا و پسندیدگی کی شہادت دی ہے: **رضی الله عنهم و رضوا عنه.** اگر سلف سے اعراض و انکار کی بنا یہ ہے کہ وہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے ناآشنا تھے تو کم از کم قرآن کا علم تو

ان کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل تو ہوا ہو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لیکن اس کے معانی و مطالب اس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہوں جب تک ارسطوئے یونانی ان کی رہنمائی نہ کرے؟

امام رازیؒ وغیرہ کو زیادہ حیرانی اس بنا پر ہوئی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا ذکر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عطف تسویہ پیدا کر رہا ہے۔ پس اولوالامر ایسا ہونا چاہیے جس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہو۔ سلاطین و امراء کو یہ منصب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بات بالکل صاف تھی، حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن و سنت قانون ہے لیکن قانون بالکل بیکار ہے اگر کوئی قوت نافذہ نہ ہو یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت اور ظاہر ہے کہ جو قوت نافذہ ہو گی، اس کی اطاعت عین قوت مقننہ کی اطاعت ہو گی۔ ایک دہقانی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت --- عین پادشاہ کی اطاعت ہے بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین قانون اور بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنا عین قانون اور پادشاہ سے بغاوت کرنا ہے۔ یہ ساری بحثیں اس لیے پیدا ہو گئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی گئی۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوتی کہ شریعت کے نفاذ اور امت کے قوام و نظام کے لیے ایک مرکزی اقتدار ناگزیر ہے اور وہ امام اور اس کے نائب امراء ہیں، تو اولی الامر کا مطلب بالکل صاف تھا کسی کاوش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔

"فان تنازعتم الخ" سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک "اربابا من دون اللہ" میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ، ارضی خلیفہ نہیں ہے آسمانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے لیکن اسلامی خلافت کی اصل و بنیاد خلافت ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت اور امت کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ ہے نہ کہ مقننہ۔ اس کی ذات کو اصل شریعت اور اس کے احکام میں کوئی دخل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوه الی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آ جائے جس میں نزاع و اختلاف پیدا ہو تو پھر اس کے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز اولے و حقیقی کا۔ یعنی قرآن و سنت کا اور خود خلیفہ بھی اس کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد۔

یہی وجہ ہے کہ اطیعو اللہ" کے بعد پھر "اطیعوا الرسول" میں فعل کا اعادہ کیا گیا۔ مگر اولی الامر میں نہیں کیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ اصل اطاعت جو مطلوب ہے وہ اللہ کی ہے اور رسول کی ہے۔ یعنی کتاب و سنت کی اور اولوالامر کی اطاعت صرف اسی لیے ہے تاکہ کتاب و سنت کی اطاعت

کی جائے۔ بالاستقلال نہیں ہے۔ پھر "فان تنازعتم" کہہ کراور زیادہ واضح کردیا کہ اگر اولی الامر کتاب وسنت کے خلاف حکم دے تو پھراس حکم میں اس کی اطاعت نہیں ہے اللہ اوراس کے رسول ہی کے حکم کی طرف لوٹنا چاہیے قاله الطيبى فى الشرح

بعض امراء بنوامیہ نے اپنے مظالم وبدعات کی اطاعت کرانے کے لیے جب اس آیت سے استدلال کیا اور کہا: الیس اللہ امرکم ان تطیعونا فی قوله "واولی الامرمنکم!" کیا خدا نے تم لوگوں کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے کہ "اولی الامر منکم؟" تو بعض ائمہ تابعین نے کیا خوب جواب دیا۔ الیس قد نزعت عنکم بقوله فان تنازعتم" ہاں، مگر پھر اس منصب سے تم محروم بھی تو کردیے گئے جب فرمایا کہ "فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول۔

غرضیکہ اس آیۂ کریمہ میں قرآن نے اس قانونِ شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ وامام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اوراسی کا وجود نظام جماعت کا مرکزِ اقتدار ہے۔

شرح حدیث حارث اشعری

احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔اس بارے میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ وحفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید ورسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر ویقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلّی اللہ علیہ وسلّم :انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ والسمع، والطاعۃ،والھجرۃ، والجھاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر، فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من حبثی جھنم. قالوا یارسول اللہ وان صام وصلّی؟ قال وان صلّی وصام وزعم انہ مسلم. اخرجہ احمد والحاکم من حدیث " الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین قال ابن کثیرھذا حدیث حسن ولہ الشواھد.

یعنی فرمایا۔ میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں:

(۱) پہلی چیز "جماعت" ہے یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ وامام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور سمٹی ہوئی جماعت

کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

"جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔

"اتحاد" سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں کسی گوشہ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف" کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے۔ "اتحاد" صرف باہم مل جانا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو لیکن "ائتلاف" سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے، وہی جگہ اسے ملی ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور عمرو کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو سیر بھر قرار دے دیا جائے۔

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہدگر میل نہیں کھاتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں گے، باہم مل کر ایک جان نہ ہو پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ باہدگر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں اسی طرح افراد انسانی کو بھی اس لیے پیدا کیا تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ "جماعت" ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا محض ایک ٹکڑا ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو یہ نگینہ اسی انگشتری کے لیے تھا:

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص واوصاف نہ تو حاصل ہوسکتے ہیں نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالاتر فعال ومدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور موتلف ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک ''امام'' کا وجود ناگزیر ہوا اور سی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام ومطاع تسلیم کرلیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد وائتلاف اور امتزاج ونظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک حی وقائم جماعتی وجود پیدا کردینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے اور پھر ہر ملک، ہر آبادی اور ہر گروہ میں اس کے ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلاقیام امام کے زندگی بسر کریں حتی کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کرلیا جائے۔ ''اذا کان ثلاثة فی سفر' فلیؤ مروا احدھم''

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلا دیا گیا کیونکہ نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد واعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں، مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں آتے ہیں، لیکن یکایک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کردیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزا کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں سب کے چہرے ایک ہی جانب۔ قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں۔ جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بیک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد وممزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم، پھر دیکھو، سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال وافعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکادے جب چاہے سب کو اٹھادے۔

اسلام کی زبان میں ''جماعت'' سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبوہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔ جماعت کے جن اوصاف وخواص کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ تمام تر قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں لیکن شواہد کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۲) دوسری چیز ''السمع'' ہے یعنی امام جو احکام دے اس کو سننا اور اس سے تعلیم وارشاد حاصل کرنا۔ ''سمع'' کے لفظ میں قبولیت احکام طلب وتعلیم، دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز ''طاعت'' ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت وفرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا اور اس کے ہر حکم کی بلا چون وچرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ انما الطاعة فی المعروف۔

(۴) چوتھی بات ''ہجرت'' ہے۔ ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔

''الهجر والهجران مفارقة الانسان غيره اما بالبدن او باللسان اوبالقلب والمهاجرة، مصارمة الغير ومتاركة (۵۵۸)''[1]

اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت وصداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنی دنیوی محبوبات ومالوفات ترک کر دے۔ مثلاً دولت کو، آرام وراحت کو، عزیز واقربا کے قرب کو، وطن کو، مکان کو تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسولؐ اور ان کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی: ''انی مهاجر الی ربی'' اور'' انی ذاهب الی ربی''۔

چونکہ وطن ومکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل وعیال، مال ومتاع، دوست واحباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت والفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترک وطن کی ہجرۃ اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر کیا گیا۔ ولكل امرى مانوى. فمن كانت هجرته الى الله ورسوله فهجرته الى الله ورسوله ومن كانت هجرته للدنيا يصيبها، او امراة يتزوجها فهجرته الى ماهاجر اليه (بخاری عن عمرؓ) یعنی ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی، اور جس نے اس لیے گھر چھوڑا کہ دنیا کمائے، یا نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوئی جس کے لیے اس نے گھر چھوڑا۔ پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب بعضھا فوق بعض کتاب وسنت اس کی تفصیل سے لبریز ہیں۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

پانچویں چیز ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔ ''جہاد'' جہد سے ہے جس کے معنی ''استفراغ الوسع فی مدافعة العدو ظاهراً وباطناً ہیں (مفردات راغب)۔ یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم وباقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ وجاهدوا المشركين باموالكم وانفسكم والسنتكم'' رواه ابوداؤد، واحمد

ونسائی وابن حبان عن انس)

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاو قیام کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی وعمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بھی بغیر جماعت، اطاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب ان ہی پانچ سچائیوں کے ثمرات ونتائج ہیں۔

دنیا کے تمام نزاعات واختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء ومصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد وعسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہ عمل میں حقیقت ومسمٰی کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے اور گو سب طلب گار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم گر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد۔ دوسرا کہتا ہے عسل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھاوے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ اختلاف مسمٰی میں نہیں ہے صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب وروز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے لیکن اپنی اصطلاح ورسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلافات سے لے کر معاشرت ورسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر واسماء کے تمام پردے اٹھا دیئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آ جائے تو یکا یک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے۔ اگرچہ بھیس مختلف ہیں اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر!

علوم وحقائق کے مشاہد ومناظر میں یہ مشہد سب سے اعلیٰ وارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "علم الجمع بین المختلفات" سے تعبیر کرتے ہیں [۲] اور عامۂ اصحاب اشارات وسلوک نے "مشہد وحدت" کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کے لیے کشف حجب اور سیر حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوت نظر وفکر ہے جو ظواہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جائے اور اسماء وتعبیرات کے اختلافات دور کر کے مقاصد ومعانی کا اتحاد معلوم کرے۔ بہ حدیکہ سارے نزاعات واختلافات دور ہو جائیں اور سخت سے سخت متنازع ومتضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل

مطلوب دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد دنیا کی وہ عالمگیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے یہ ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے دنیا کو اختلاف ہے لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی، اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز ''جماعت'' ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گزر چکی۔ غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے۔ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو۔ صاف اور سیدھے سادے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہی پر غور کر لو، سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ ''جماعت'' اور ''التزام جماعت''۔ وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار و رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو تو سب سے پہلے ایک پریزیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو! خود تمہارا گھر بھی تو ایک چھوٹی سی آبادی ہے؟ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو! اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں تو تم کیوں لڑتے ہو اور تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں۔ روز خانہ جنگی ہوتی ہے یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ '' الجماعة والسمع والطاعة پر عمل نہیں ہو رہا۔'' کوئی جماعت امن و نظم و ضبط نہیں پا سکتی جب تک اس کا کوئی امیر نہ ہو اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے تم گھر کے بڑے ہو یعنی امیر ہو۔ پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہے پر چلیں۔

''ہجرت'' کا لفظ کس قدر تمہارے لیے نا آشنا اور نا مانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ''ہجرت'' کی حقیقت سے کب خالی ہیں!! اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے۔ 'ہجرت'' سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہو سب کو چھوڑ دینا۔ پھر بتلاؤ علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبے کے مل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے اس نے پالی ہو۔ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو تو معلوم کرلو گے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے' اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے، گھر کے عیش، اہل و عیال کی محبت' خویش و بیگانہ کی الفت اور ملک و وطن کی دامن گیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پشت پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولۂ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا! کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں۔ دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے۔ جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویہ و اشیا کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارا نہ کرتے تو اشیا کی تحقیق کیونکر ہوتی! پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتیں؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو سکتیں! نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا تو آج دنیا کا نصف تمدن ناپید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی سر بفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں تو آج تمام دنیا کی

دولت ان کے گھروں میں کھنچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان وہلاک ہوجائیں تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبہ نوع پرستی کی انتہا ہے لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ ''ہجرت'' سے تعبیر کرے تو تم اس کا انکار کردو۔ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھربار چھوڑدیں اور ہلاک ہوجائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ کشش ثقل کا قانون دریافت کرے تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر تم عزم وطلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازم صادق کے لیے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کے لیے اپنا گھربار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے!

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد'' کالونیل سسٹم کو یقین کرتا ہے یعنی نوآبادی کے اصول کو اور اس کا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ وقتال میں مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نوآبادی کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی نہ کہ ترک وطن کرکے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا اور قومی دولت وطاقت کو بڑھانے کے لیے دنیا میں دور دور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو یہ وہی ''ہجرت'' اور ترک وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور **الجماعة والسمع والطاعة والھجرة**'' پر دنیا عمل کررہی ہے یا نہیں؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے۔

''جہاد'' کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان ومال سے کمال درجہ سعی ومحنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ وقائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء وقیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ ''جہاد'' سے تعبیر کیا ہے۔ اگر تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقاء Struggle for Existences اور انتخاب طبیعی Natural Selection اور بقائے اصلح Survival of the Fittest کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح وامثل کے لیے ہے تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو اور فطرت کے قتل وغارت کا افسانہ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن واسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں تک پر نافذ ہے اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہوسکتی ہے! پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق وہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد واعمال کو مٹ جانا چاہیے اور انہیں قانون الٰہی

کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں۔" لیظهره علی الدین کله" پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارت گری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں۔ اس کو تو تم گوارا کر لو لیکن اگر اسلام کہے کہ "ان الارض لله ورسوله" خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے تو تم اس کو وحشت اور خونخواری کہو؟

حواشی

1. مفردات القرآن، امام راغب اصفہانی ص 558۔
2. تفہیمات میں لکھتے ہیں۔ "لماتمت بی دورة الحکمة. البسنی الله خلعة المجددیة فعلمت علم الجمع بین المختلفات

جماعت والتزام جماعت

یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیت۔ جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علیحدگی اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا۔ اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی، وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و ائتلاف کہ تمام منتشر افراد کو ایک متحد جماعت بنا کر نفس واحد کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیئے: ''وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ'' الخ(۳:۱۰۳)

پس جاہلیہ کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ مزید احادیث میں سے بعض روایات صحاح یہ ہیں:

''من اطاعنی فقد اطاع الله، ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی، (صحیح عن ابی هریرة) جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی (یعنی میرے نائب کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی) اور جس نے امیر سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے انکار کیا۔ یعنی امیر المومنین کی اطاعت عین رسولؐ کی اطاعت ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں ''امیری'' کی جگہ صرف ''الامیر'' ہے یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو، اس کی اطاعت۔

'' اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسه زبیبة'

(صحیحین عن انس)

اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے، تو چاہیے کہ اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار باراور اکثر سے خطبوں میں آپ ﷺ فرماتے تھے۔اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت سے مروی ہے۔ حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقعہ پر (جب کہ دو تین ماہ کے بعد آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے اور ایک آخری پیام دنیا کو سنا رہے تھے) فرمایا"**ولواستعمل عليكم عبد يقودكم بكتاب الله، اسمعوا و اطيعوا**"(مسلم) اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے تو اسکی سنو اور اطاعت کرو۔

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة، فمات، مات ميتة جاهلية وعن ابن عباس " من راى من اميره شيئا يكرهه فليصبر، فانه من فارق الجماعة شبراً فمات، مات ميتة جاهلية" وفي لفظ" فانه ليس احد من الناس خرج من السلطان شبراً فمات عليه الإمات ميتة جاهلية" (متفق عليه)

یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا، خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی (اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گزرا ہے، اس کو عہد جاہلیت کہتے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیت کی طرح گمراہی پر موت ہوئی)۔ دوسری روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر کرے۔اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو کوئی سلطان اسلام کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہو اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی حالت پر ہوئی۔حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے:"

من خلع يداً من طاعة، لقي الله يوم القيامة ولاحجة ومن مات وليس في عنقه بيعة، مات ميتة جاهلية.

جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا یعنی اطاعت نہ کی، تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی بیعت واطاعت کے حلقہ سے اس کی گردن خالی ہوئی تو یقین کرو کہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

"**من فارق الجماعة شبرا فكانما خلع ربقة الاسلام من عنقه** (ترمذی) یعنی جو جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ایک روایت میں ہے "**دخل النار (اخرجه الحاكم على شرط الصحيحين)** یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

"**كانت بنواسرائيل تسوسهم الانبياء. كلماهلك نبي خلفه نبي و انه لانبي بعدي. وسيكون خلفاء فيكثرون. قالوا فما تامرنا؟ قال. فوابيعة الاول فالاول، ثم**

اعطوهم حقهم، فان الله يسائلهم عما استرعاهم" (متفق عليه)

بنی اسرائیل کی رہنمائی وریاست انبیاء کرتے تھے۔ایک نبی گیا تو دوسرا اس کی جگہ مامور ہوا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، البتہ خلفاء ہوں گے۔لوگوں نے عرض کیا ہم کو ان کی نسبت کیا حکم ہوتا ہے؟فرمایا! جس سے پہلے بیعت کی یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی گئی اس کی اطاعت مقدم ہے پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو۔اور فرمایا ان کا تم پر جو کچھ حق ہے وہ ان کے حوالے کرو یعنی ان کی اطاعت کرو۔زکوٰۃ وخراج وغیرہ انہی کو دو۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں۔اجماع کے شواہد اور کتب عقائد وفقہ کے اقوال نقل نہیں کیے گئے۔کہ مشہور و معروف ہیں اور احادیث کے بعد ان کی ضرورت بھی نہیں۔

شرائط امامت وخلافت

تمام نصوص و دلائل کتاب وسنت اور اجماع امت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شرائط امامت وخلافت کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں اور قدرتی طور پر یہی دو صورتیں اس مسئلہ کی ہوسکتی تھیں۔

اسلام نے اس بارے میں نظام عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب کا حق امت کو ہے اور طریق انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی و نسلی۔ یعنی قوم اور قوم کی صائب الرائے جماعت (اہل حل وعقد) کو شرائط و مقاصدِ خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیے۔ یہ حکم "وامرهم شورىٰ بينهم"۔ بنیاد تمام امور کی شرعاً شوریٰ یعنی باہمی مشورہ ہے نہ کہ نسل وخاندان۔ خلافت راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا۔ خلیفۂ اول کا انتخاب عام جماعت میں ہوا۔ خلیفۂ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور اہل حل وعقد نے منظور کرلیا۔ خلیفۂ سوم کا انتخاب جماعت شوریٰ نے کیا۔ خلیفۂ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ نسل، خاندان، ولی عہدی کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفۂ اول کے خاندان میں آجاتی' یا دوم وسوم کے خاندان میں، مگر ایسا نہیں ہوا۔ خلیفہ دوم نے تو قوم کو بھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان کے لڑکے کو خلیفہ منتخب کرے۔ وصیت کردی کہ وہ کسی طرح منتخب نہیں ہوسکتا۔

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظام شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ملے تو کیسا شخص منتخب کرنا چاہیے! اور اس میں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو۔ قوم کی رائے اور انتخاب کو اس میں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تخت خلافت پر قابض ہوجائے تو اس صورت میں اَزرُوئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ اہل نہیں ہے، ظالم ہے، جابر ہے' شرائط خلافت اس میں نہیں پائے جاتے تو اس کی اطاعت کرنی چاہیے یا اس پر خروج کرنا چاہیے؟ وہ شرعاً خليفة المسلمين ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے ماتحت وہ تمام کام انجام پاسکتے ہیں یا نہیں جو اَزرُوئے شرع خلیفہ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں؟ اس کو زکوۃ دینی چاہیے؟ اس کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیے؟ اس کے تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیے؟

یہ مسئلہ امّت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اس کی پوری پوری تشریح و توضیح نہ کر دیتی۔ اس بارے میں نصوص سنّت بے شمار اور بالکل واضح ہیں۔ اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل و تذبذب نہ ہوا۔ بالکل اس شخص کی طرح جو پہلے سے ایک خاص وقت کا سمجھا بوجھا منتظر ہو، فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کیا، اسی پر اجماع امّت کی مہر لگ گئی اور تیرہ سو برس سے جمہور اہل اسلام کا وہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پا گیا۔ بلاشبہ پہلی صورت میں بعض اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا، مگر دوسری صورت میں قولاً و فعلاً سب متفق ہو گئے۔

پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کی وہ تمام شرائط اپنے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دی ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کے لیے قدرتی طور پر ہونا چاہیے۔ کیا باعتبار قوت علمی کے، کیا باعتبار قوت عملی کے اور چونکہ یہ منصب متعدد حیثیتوں سے مرکب ہے اس لیے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم و نظر، عمل و تقوی، شجاعت و صولت، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ، طاقت و شوکت۔ چنانچہ تمام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں: "ویشترط ان یکون من اهل الولایت المطلقة الکاملة بان یکون مسلماً حراً ذکراً، عاقلاً، بالغاً، سائساً بقوة رایه ورویته، ومعونة باسه وشوکته' قادراً بعلمه وعدالته وکفایته وشجاعته علی تنفیذ الاحکام، وحفظ حدود الاسلام وانصاف المظلوم من الظالم عند حدوث المظالم" (الخ) کذا فی شرح المواقف، والنسفی، والتمهید، وشرح فقه الاکبر للقاری وشرح المقاصد. ومن کتب المحدثین شرح عقیده ابن حنبل' وفتح الباری' وشرح منظومة الاداب' وخلاصه ابن مفلح، ونیل الاوطار' وبل المرام اللشوکانی' والاقناع وشرح وغیرهم".

یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں۔ مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھتا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو، ان کے جاری و نافذ کرنے اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کے لیے جس قدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوں۔ اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و ہمت، شوکت و صولت، ساری صفتیں اس میں موجود ہونی چاہئیں۔

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی، یعنی خلافت خاندان قریش و عرب میں رہی۔ (۶۴۰ھ مطابق ۱۲۴۳ء) تک اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک بوجہ بقائے خلافت عباسیہ مصر کے

علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بموجب حدیث "ان ھذا الامر فی قریش" خلیفہ کو قریشی بھی ہونا چاہیے۔ یعنی اگر مسلمان خلیفہ مقرر کریں تو جہاں اور بہت سی باتیں اس میں ہونی چاہئیں، وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو۔

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت ائمہ اہل بیت نبوت کے لیے منصوص ہے۔ ان کے اعتقاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا اور ان کے بعد ان کی نسل کے ائمہ عترۃ رضی اللہ عنہم کو۔

"زیدیہ" اس طرف گئے کہ بنی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت ہیں۔ ائمہ عترۃ کی خصوصیت ضروری نہیں اور شرطوں کے ساتھ صرف اس قدر کافی ہے کہ امام سید یعنی بنی فاطمہ میں سے ہو۔

لیکن دوسری صورت میں (یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ وتسلط کی صورت پیدا ہو جائے اور جمہور کو انتخاب ونصب کا موقع نہ ملے تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے)؟ سو اس کی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ وعترۃ میں بالکل صاف صاف موجود تھا' اس لیے تمام امت بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اس کی حکومت جم جائے تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ اسلام تسلیم کرے، اسی کے سامنے گردن اطاعت جھکائے۔ بالکل اسی طرح' جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکنا چاہیے۔ اطاعت واعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں خروج اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو۔ جو کوئی ایسا کرے، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے مقابلے اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں۔ وہ شرعاً باغی ہے اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا؟ اس کی علت و مصلحت اس قدر واضح ہے کہ شرح وتفصیل کی حاجت نہیں۔ شریعت اور امت کا قائم و باقی رہنا حکومت کے وجود و قیام پر موقوف تھا۔ ساری باتیں شاخ ہیں۔ جڑ یہی مقام ومنصب ہے۔ پس اس کے لیے ایک نظام شرعی مقرر کر دیا گیا جو بہتر سے بہتر نظام ہو سکتا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوریٰ کے انتخاب پر رکھی۔ شخص، نسل، تسلط، اقتدار اور پادشاہی، ملوکیت کو اس میں دخل نہیں۔ ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کے لیے تمام ضروری شرطیں اور صفتیں بھی بتلا دیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اس کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر پورے زور کے ساتھ اس کا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت وسرداری حاصل کرنے

کا خواہشمند نہ ہونا چاہیے۔ نہ دعوے دار بن کر دوسروں سے لڑنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لیتے "لا ینازع الامر اھلہ" سرداری کا جو اہل ہوگا، اسی پر سرداری چھوڑ دیں گے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملہ پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہوجائیں۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے۔ مایکرہ من الحرص علی الامارۃ" اور ابوموسی کی روایت لائے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: "انا لا نولی ھذا من سالہ ولا من حرص علیہ "جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو اس کو میں یہ کام سپرد نہ کروں گا۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب و حرص نہ کریں گے تو کش مکش اور مقابلہ بھی نہ ہوگا اور امت کے لیے نہایت آسان ہو جائے گا کہ اہل و اصلح کو منتخب کرے۔

مسئلہ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ تھا۔ اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن و سکون کی بہشت بن جائے۔ لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں، اس لیے شرع و ملت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ نظام اصلی پر زور دینے کے ساتھ ان وقتوں کے لیے بھی صاف صاف احکام دے دیے جائیں جب انتخاب و نصب خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹھہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے اور جمہوری حکومت کی جگہ شخصی و استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کرلی جائے تو اس سے امت کی جمعیت، جان و مال کا امن، ممالک اسلامیہ کی حفاظت، احکام شرع کا اجراء، جماعت کا قیام دبقا اور اسی طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور مزید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سد باب ہو جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر شرعی نظام کے قائم ہو جانے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

لیکن اگر خلافت تسلیم نہ کی جائے، ان پر خروج کرنے کی اجازت دے دی جائے اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشروط خلیفہ ہی کو قرار دیا جائے تو پھر وائی کشت و خون، جنگ و قتال، دعووں میں تصادم، قوتوں میں تزاحم، ہمیشہ کی بدامنی، کبھی نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی اور انارکی، امت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال، احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال کی بدامنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بیشمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا ہمیشہ کے لیے دروازہ کھل جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کی امید بھی کی جاسکتی ہے کہ شاید ان بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نااہلوں کی جگہ کسی اہل اور جامع الشروط کو خلافت دلائی جاسکے۔

پہلی صورت میں مصلحت کا بقاء وحصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔ دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالح کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی اور پوری قوت واصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کردی۔ یعنی مصالح کے امکان پران کے وقوع کو ترجیح دی۔

کیا دنیا میں ایک عقل صحیح بھی ایسی مل سکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتلائے؟ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالح اور دفع مفاسد ہے۔ یعنی ہمیشہ فوائد حاصل کرنا اور مفاسد کو دور کرنا اور جب مصالح کے ساتھ مفاسد بھی جمع ہوجائیں تو جس راہ میں مصالح زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اسی کو اختیار کرنا۔ تمام احکام کا محور یہی اصل ہے پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کے لیے خلیفہ کا جامع الشروط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دے دیا جاتا تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا؟ نصب واستخاب کے لیے نظام شرعی درہم برہم ہوچکا تھا۔ ہر دماغ میں حرص ودعوی اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف الملوکی اور انارکی پھیل جاتی۔ ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل ومستحق نہیں ہے۔ بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ تمام امت میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی۔ شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا۔ آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا۔ نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا، نہ ڈاکوؤں سے کوئی بچانے والا۔ زکوٰۃ کس کو دی جاتی؟ جمعہ کون قائم رکھتا؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا؟ تمام عالم اسلام ایک دائمی خانہ جنگی وبدامنی میں مبتلا ہوجاتا۔ امن ونظم ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجاتا؟ دشمنان اسلام ہر طرف سے امنڈ آتے۔ ان کو روکنے کے لیے کوئی طاقت موجود نہ ہوتی۔ پس اگرچہ ایک نااہل مسلمان کا خلیفہ ہوجانا برائی ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ برائی ہے کہ تمام ملک برباد ہوجائے۔ اسلام نے ملک وشرع کی حفاظت کو مقدم رکھا جو کلی مصلحت کا حکم رکھتی ہے اور نااہل وفاقد الشروط کا تسلط گوارا کرلیا۔ جس کا فساد جزئی فساد ہے۔

حواشی

۱ حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح وتفسیر کا قرض اب تک امت کے ذمہ باقی ہے۔ بیشمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی یہ قول ویسا ہی صحیح ہے جیسا کہ ابن خلدون کے عہد میں تھا۔ اس کتاب کے علوم و دقائق کا کوئی احاطہ نہ کرسکا۔ ہر کتاب، ہر باب، ابواب کی ہر ترتیب اور ہر ہر عنوان وترجمہ، اس فقیہ الارض واعجوبتہ

الدہر کی فقاہت ربانی کی ایک آیت باہرہ وحجۃ قاہرہ ہے۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ اور دیکھو، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں؟ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیت اس بارے میں کیا ہے؟ تو پہلا باب ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم'' کا باندھا۔ اور ''من اطاع امیری فقد اطاعنی'' (الخ) کی روایت درج کر کے بتلادیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے، رسول اللہ ہے اور پھر خلیفہ وامام ہے۔'' اولوالامر'' خلیفہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس کی اطاعت (بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو) مثل خدا اور رسول کی اطاعت کے فرض ہے۔ پھر باب باندھا ''الامراء من قریش'' اور اس میں ابن جبیر والی روایت لائے ''ماقاموا الدین''۔ جب تک قریش میں دین قائم رکھنے کی اہلیت رہے گی خلافت بھی انہی میں رہے گی۔ یعنی واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قریشی خلافت کی پہلے سے خبر دے دی گئی ہے مگر خلیفہ کا قریشی ہونا کوئی شرط اصلی وتشریعی نہیں۔ صرف پیش گوئی ہے اور ''ماقاموا الدین'' کے ساتھ مشروط۔ اسکے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باب باندھا ''اجر من قضی بالحکمۃ''۔ افسوس اس باب کے ربط وترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھے۔ منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آتی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے؟ اور اس کا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اس کی طریق ''حکمت'' پر ہے۔ یعنی انبیاء کرام کے طریق تربیت امم پر جو ''سنت'' کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے اور جس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں ''حکمت'' سے تعبیر کرتا ہے۔ ترجمہ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے ''ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون'' حکم وقضا ''ماانزل اللہ'' کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر خلاف ہو تو فسق ہے ''ماانزل اللہ'' کتاب و سنت ہے ''یعلمھم الکتاب والحکمۃ'' پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد حکمت ومنہاج نبوت پر ہونی چاہیے۔ اس بارے میں جو زیادہ واضح ومفصل احادیث تھیں، وہ چونکہ ان کی شروط کے مطابق نہیں لی جا سکتی تھیں اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں اس لیے آثار وموقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے۔ پس مشہور حدیث ''لاحسد الا فی اثنتین'' (الخ) درج کر کے قضا بالحکمت کی اہمیت ومطلوبیت واضح کر دی۔ جب یہ مقدمات طے ہو چکے تو اب دکھلانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کر دی گئی ہے؟ پس باب باندھا السمع والطاعۃ الامام مالم تکن معصیۃ'' امت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے۔ بجز اس حکم کے کہ معصیت ہو۔ اس میں وہ تمام احادیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہو یا نا اہل، جامع الشروط ہو یا فاقد الشروط، عادل ہو یا جابر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے، نماز قائم رکھتا ہے اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ کسی مسلمان کے لیے اس کی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں اس کے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں۔ ''من لم یسال الامارۃ اعانۃ اللہ'' دوسرا ''من سال الامارۃ وکل

الیها"۔ تیسرا "مایکرہ من الحرص علی الامارة" حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے امت کو خلیفہ وامام کی ضروری صفتیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو اور اس کے لیے مقابلہ کرے۔ حتی کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ سے کہا "جو اہل اور احق ہو اور اس کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگر چہ اس کے لیے قسم بھی توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے۔" پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظام شرعی کی اصلی ترتیب یہ ہے۔

(الف) امت کے لیے حسب نص "واولی الامر منکم" مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہے۔

(ب) خبر دیدی گئی تھی کہ جب تک عرب وقریش میں صلاحیت رہے گی خلافت پر قابض رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(ج) بنیاد معاملۂ خلافت کی "حکمت" پر ہے وہ حکمت کہ جو "ویعلمهم الکتاب والحکمة" میں مضمر ہے۔ یہ نیابت نبوت ہے اور اعمال وسنت نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "حکمت" ہے۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد سنت پر ہو۔ بدعت و احداث پر نہ ہو۔ یہی معنی خلافت "علی منهاج النبوة" کے ہیں۔

(د) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اس کی اطاعت فرض ہے فی ما احب ویکرہ۔ مالم یؤمر بمعصیة۔

(ہ) امت کو چاہیے کہ احق واہل کو منتخب کرے۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خود خلافت کی خواہش کرے۔ جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے اور حق انتخاب جمہور کو ہے تو کسی طرح بھی کش مکش نہ ہوگی۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا۔ امن سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائے گا۔

یہ تھا صحیح نظام شرعی، جس کے علم وفہم کے لیے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جس کے لیے صحیح بخاری کافی نہیں؟ لیکن افسوس کہ نظام شرعی قائم نہ رہا۔ شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہوا اور محض تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے۔ چنانچہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی گئی تھی۔

نصوص سنّت و اجماع امت

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنی چاہیے اگر داعی اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ آنے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اول روز ہی بتلادی گئیں؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا گیا؟ یہ معاملہ اس قدر یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے ماورا ہے کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کے لیے تیار نہیں تو دنیا کے پاس ماضی کی جس قدر معلومات موجود ہیں ان میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں ہوسکتی۔ نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی بادشاہ گزرا نہ روما نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی، نہ ہم بیسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ نپولین کا وجود اور واٹرلو کی جنگ کا وقوع تسلیم کرلیں۔

بہرحال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پیشتر سے معلوم تھے۔ ہر حالت اور ہر وقت کے لیے صاف صاف حکم دے دیا گیا تھا۔ احادیث کے اس حصہ کا نہایت وسعت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر دور کی خاص حالت ہے اور اس لیے اسی کے مطابق خاص حکم ہے۔

سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت خاصہ وراشدہ کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ خلافت ٹھیک طریق نبوت وسنت پر قائم ہونے والی تھی اس لیے امت کو وصیت کی ہے کہ نہ صرف ان کی اطاعت کی جائے بلکہ ان کی تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثل اعمال نبوت کے "سنّت" سمجھا جائے اور اس کی پوری طرح پیروی و اتباع کی جائے۔

چنانچہ مشہور حدیث عرباض بن ساریہ "قام فینا رسول اللہ صلّی اللہ علیه وسلّم ذات یوم، فوعظنا موعظه بلیغة، وجلت منها القلوب، وذرفت منها العیون فقیل یارسول اللہ! وعظتنا موعظته مودع فاعهد الینا بعهد. قال علیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعه وان کان عبداً حبشیاً، وسترون من بعدی اختلافاً شدیدا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضوا علیها بالنواجذ" (ابن ماجه وترمذی) اور حدیث "خیرالقرون قرنی ثم یلونهم (الخ) اور اما طبقتی وطبقة اصحابی فاهل علم وایمان" (الخ) رواه البغوی عن انس وامثالها، اسی قسم میں داخل ہیں۔

خلاصہ ان کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سنو اور مانو اگر چہ وہ ایک حبشی غلام ہو اور دیکھو میرے بعد بڑے سخت اختلافات پڑنے والے ہیں۔ پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کار بند رہو اور اس کو اس طرح مضبوطی سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانتوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے اور فرمایا بہتر زمانہ میرا ہے پھر وہ جو میرے بعد کا ہے اور فرمایا: میرا اور میرے اصحاب کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث۔ ''ما من نبی بعثه الله فی امة قبلی الا كان له حواريون و اصحاب ياخذون بسنته ويقعدون بامره، الخ (مسلم) میں بھی اسی عہد خلافت کا ذکر کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اس پہلے دور کے لیے دو حکم دیے گئے ایک طاعت کا، دوسرا اقتداء اور پیروی کا۔

لیکن اس کے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں، جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہا لیکن دوسرا حکم بالکل بدل گیا۔ یعنی اس دور کے خلفاء وسلاطین کی اطاعت کی تو ویسی ہی وصیت کی جاتی ہے جیسے پہلے دور کے لیے کی گئی ہے لیکن ان کے کاموں کی پیروی اور اقتداء کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ بتدریج ترک اقتدا ر و مخالفت کا حکم دیا جاتا ہے اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ خلافت پر قابض و مسلط ہوں گے، ان کی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہوگی اور نہ ان کا چلن قرآن وسنت کے مطابق ہوگا۔ ان میں اچھے بھی ہوں گے اور برے بھی اس لیے امت کو اب صرف اطاعت کا اور ان کی خلافت کے آگے سر جھکا دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ انکے طور طریقوں کی پیروی کرنے اور ان کے کاموں کو شرعی کام سمجھ لینے کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ اس بات کی بھی وصیت کی جاتی ہے کہ جب وہ لوگ برائیاں پھیلائیں تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے برائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے۔ ہاتھ سے کام لے، زبان کو حرکت میں لائے اور اگر یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں تو کم از کم دل ہی دل میں برائی کو برا سمجھے۔ و ذالک اضعف الایمان۔ لیکن برے کاموں کو ان کی حکومت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ ان کا ساتھ دے ''ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل'' [1] عن '' عبادة بن الصامت. قال ''بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فی منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا والرة علينا، وان لاتنازع الامر اهله، الا ان ترو ا كفرا بواحا عندكم فيه من الله برهان'' (متفق علیہ)۔ عبادہ بن الصامت کہتے ہیں ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر بیعت لی کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کریں گے۔ حکومت و سرداری کو اس کے کرنے والوں پر چھوڑ دیں گے اور کبھی اس

بارے میں کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ الا یہ کہ بالکل کھلا کھلا کفر امام سے ظاہر ہو اور ایسی بات میں جس کے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے تو اس وقت کسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے نہ روک سکے گی۔ یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ سرزد ہو، ہر حال میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم، وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم" قال قلنا افلاننا بذهم عند ذلک؟ قال "لا" مااقاموا فیکم الصلوة الا من ولی علیه وال فراه شیئاً من معصیة الله فلیکره مایاتی من معیصة الله ولاینزع عن یداً من طاعة، (رواه احمد ومسلم)

وعن حذیفة اله (صلعم) قال" یکون بعدی المة لایهتدون بهدی ولایستنون بسنتی وسیقوم فیکم رجال قلوبهم قلوب الشیاطین فی جثمان انس." قال قلت" کیف اصنع یارسول ان ادرکت ذالک"؟ قال تسمع وتطیع وان ضرب ظهرک واخذ مالک فاسمع واطع"(رواه مسلم. و احمد)

یعنی فرمایا تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ انکی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری ان کے دلوں میں۔ تمہاری زبانوں سے ان کے لیے رحمت کی دعا نکلے اور ان کی زبانوں سے تمہارے لیے۔ اور بدترین حاکم وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کی دشمنی ہو اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھگڑیں۔ فرمایا نہیں۔ جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں ان کی اطاعت ہی کرو۔ ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اسے پسند نہ کرو۔ مگر امام کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔ نیز فرمایا میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرا طریقہ چھوڑ دیں گے اور میری سنت پر نہیں چلیں گے۔ عنقریب تم پر ایسے حکمران ہوں گے کہ ان کا جسم انسانوں کا ہوگا مگر دل شیطان کا سا۔ راوی نے پوچھا اگر ہم نے ایسا زمانہ پایا تو کیا کریں۔ فرمایا سنو اور اطاعت کرو اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں جب بھی ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

ستکون بعدی اثرة وامور تنکرونها. قالوا فما تامرنا؟ قال تودون الحق الذی علیکم وتسالون الله الذی لکم"(متفق علیه) عن ابن مسعود، واخرجه ایضاًالحرث بن وهب و اورده الحافظ فی التخلیص،وعن جابر بن عتیک مرفوعاً عند ابی داؤد بلفظ سیاتیکم رکب مبغضون،فاذا توکم فرحبوا بهم و خلوا بینهم وبین ما یبغون. فان عدلوا فلا نفسهم،وان ظلموا فعلیهم

وعن وائل بن حجر. قال سمعت رسول الله صلعم ورجل یساله فقال ارایت

ان کان علینا امراء یمنعونا حقنا ویسألونا حقهم قال" اسمعوا واطیعوا فانما علیهم ما حملوا،وعلیکم ماحملتم (مسلم والترمذی وصححه)

"علی المرء المسلم السمع والطاعة فی ماأحب وکره الا ان یؤمر بمعصیة فان امر بمعصیة فلاسمع ولاطاعة" (شیخان وغیرهما عن ابن عمر)

سب کا خلاصہ وہی ہے جواوپر گزر چکا۔ آخری روایت میں فرمایاایک مسلمان کا فرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا نا گوار، مگر امام کا کہا سنے اور مانے۔ ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جس کی تعمیل میں گناہ ہو توپھراس حکم میں نہ تو سننا ہےاور نہ ماننا۔

بڑی سے بڑی مخلوق کی خاطر بھی خدا کا چھوٹے سے چھوٹا حکم نہیں ٹالا جاسکتا اور نہ مخلوق کی خاطر خالق سے نافرمانی کی جاسکتی ہے۔ یہ اسلام کا،اوردراصل دنیا کی تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ صدقات وزکوۃ وغیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت حکم دیا گیا کہ اگر چہ وصول کرنے والے حکام ظالم وجابر ہوں یا بیت المال کا روپیہ ناجائز طور پر خرچ کررہے ہوں لیکن اگر امام کی طرف سے مامور ہیں تو ان کی اطاعت ہی کرنی چاہیے۔ جس شخص نے زکوۃ ایسے عامل کو دے دی اس کی زکوۃ ادا ہوگئی۔ بلاشبہ قوم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں لیکن جب تک معزول نہ ہوں نظام شریعت وحکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہاان قوما من اصحاب الصدقة یعتدون علینا اعمال صدقہ لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں ان کا مقابلہ کریں؟ فرمایانہیں (ابوداؤد)

سعد بن وقاص کی روایت میں فرمایا۔ ادفعوا الیهم ما صلوا

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمرؓ کی نسبت ہے کہ کسی نے پوچھا زکوۃ کسے دیں؟ کہاوقت کے حاکموں کو۔سائل نے کہا۔"اذا یتخذون بهاثیاباً وطیباً" وہ تو زکوۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کرڈالتے ہیں۔فرمایا"وان" اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگرزکوۃ انہی کو دو۔

اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا ہے"براء ة رب المال بالدفع الی السلطان مع العدل والجور" کما فی المنتقی "یعنی صاحب مال نے جب اپنی زکوۃ عمال کے حوالے کردی تو وہ شرعا بری الذمہ ہوگیا اگرچہ وہ ظالم وجابر ہوں اوراسی لیے جمہور فقہا کا بھی یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکام جور کو زکوۃ دے دی گئی تو ادا ہوگئی۔ ائمہ اہل بیت وعترۃ نے بھی قولاًوفعلاً اس سے اتفاق کیا جیسا کہ حضرت امام باقر علیه وعلی آبائه السلام سے اصول میں منقول ہے اوراسی لیے محققین امامیہ وفقہاء زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔

❁......❁......❁

حواشی

۱ احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ مختلف حدیثوں میں مختلف دوروں اور لوگوں کا ذکر ہے۔ اس لیے احکام بھی مختلف ہوئے۔ اس نکتہ پر جس کی نظر نہ گئی وہ احکام وعلائم کو مختلف ومتضاد دیکھ کر یا تو حیران رہ گیا یا سخت غلطیوں سے دوچار ہوا۔ عہد نبوت سے لے کر آخر تک مختلف دور آنے والے تھے۔ ہر دور کے خصائص وحالات دوسرے سے مختلف تھے۔ پس ان کے احکام میں بھی اختلاف ضروری تھا۔ پوری دقت نظر کے ساتھ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پہلے ان کے باہمی مشترکات، مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیے پھر ہر حدیث اور حکم کو اس کی صحیح جگہ دینی چاہیے ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ "اطاعت" اور "اقتداء" کا فرق نہ سمجھے۔ جن حدیثوں میں "اقتداء" کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا ان کو منع اطاعت اور جواز خروج پر محمول کر لیا۔ خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام اور مطلق سمجھ لیا اور منع اقتداء وتاسی اور وجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی وہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء وحکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، خواہ ان کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر ٹوکیں، نہ منکرات کے خلاف جدوجہد کریں۔ ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں۔ یہ جو صدیوں سے علماء ومشائخ نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یک قلم ترک کر دیا ہے تو نفس خادع ان کو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ ان لوگوں نے چونکہ "اطاعت" اور "اقتدار" کا فرق نہیں سمجھا اور دیکھا کہ پادشاہوں اور امیروں کو برائی پر ٹوکنے اور ان کے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ یہی مصائب فتنہ ہیں۔ پس اس فتنہ سے بچنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق وباطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ تمام زبانیں گونگی اور تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے۔

حالانکہ دونوں جماعتوں نے ٹھوکر کھائی۔ دونوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا۔

ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں اور ایک بادشاہ کی جیسی فرمانبرداری رعایا کو کرنی چاہیے ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرمانبرداری بجالائیں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے۔ اس کا نام "اطاعت" ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو اپنے دینی واخلاقی اعتقاد وعمل میں پیشوا مان لینا اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنا لینا اور اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرنا، اس کا نام "اقتدا" اور "تاسی" ہے۔ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ "اطاعت" ایک عام حالت ہے اور اس میں "اقتداء" کی حالت بھی داخل ہے لیکن "اقتداء" اطاعت سے زیادہ خاص ہے اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت

اقتدا بھی ہو۔ احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو "اطاعت" اور "اقتداء" دونوں کا حکم دیا گیا لیکن بعد کے خلفاء وسلاطین کو صرف "اطاعت" کا مستحق بتلایا "اقتداء" کا نہیں۔ کیونکہ معلوم تھا کہ ان کے کام اچھے نہ ہوں گے شریعت وعدالت سے منحرف ہو جائیں گے اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب وسنت اور عدل وصداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا۔ اس لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا۔ یعنی حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مان کر پوری پوری اطاعت کرو لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ اور دن کو رات مان لو، حق حق ہے، باطل باطل۔ برائی جب دیکھو، ٹوکو۔ ظلم جب کیا جائے روکو اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور دونوں برابر ہیں۔ **لاطاعة المخلوق فی معصية الخالق**. قاعدہ کلیہ ہے اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (۱۰۳:۳) حکم عام ومطلق۔ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم کی نافرمانی کرنی پڑے اور یہ جو جا بجا کہا گیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے تو یاد رہے کہ "اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے نہ کہ "اقتدا" نہ کرنے میں اور **امر بالمعروف ونهی عن المنکر** میں۔ یعنی خلیفۂ اسلام سے بغاوت نہ کرو اس میں جمعیت امت کے لیے بڑا ہی فتنہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے۔ حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کے لیے نظم وامن ہے۔ وہ کبھی فتنہ نہیں ہوسکتا۔ اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی کس بنیاد پر قائم رہے؟ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۲۳:۷۱)

اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا اخرهما

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کھڑا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے فرمایا اسے قتل کردو۔ اس کی زندگی تمام امت کے نظم و امن کے لیے فتنہ ہے وہ امت میں پھوٹ ڈالنا اور جمے ہوئے انتظام کو درہم برہم کردینا چاہتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔(۲:۱۹۱)

عن عرفجه الاشجعی قال. سمعت صلعم یقول " من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد' یرید ان یشق عصاکم اویفرق جماعتکم فاقتلوه" (احمد ومسلم).

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہو یا نااہل لیکن اگر اس کی حکومت قائم ہے تو جو اس پر خروج کرے، اس کا حکم باغی کا ہوگا اگرچہ کتنا ہی افضل اور جامع الشروط ہو۔ اس سے لڑنا اور اس کی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے بشرطیکہ تبلیغ و دعوت اور دفع شکوک کے بعد بھی باز نہ آئے۔ ایک گروہ علما نے کہا کہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بہ حکم فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ (۴۹:۹) واجب ہے۔" **وقد حکی فی البحر عن العترة جمیعا ان جهادهم افضل من جهاد الکفار الیٰ دیارهم، اذ فعلهم فی دار الاسلام کفعل الفاحشة فی المسجد"** (نیل الاوطار۔ جلد ۷ صفحہ ۸۰) یعنی امام ائمہ اہل بیت و عترۃ سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے۔

مصلحت و حکمت اس حکم کی ظاہر ہے۔ اگر اول روز ہی سے دعوؤں اور خروج کا دروازہ بند نہ کردیا جاتا تو کوئی بہتر سے بہتر اسلامی حکومت بھی خروج و شورش سے محفوظ نہ رہ سکتی۔ ایک جامع الشروط خلیفہ کی موجودگی میں بھی صدہا دعویدار اٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے کہ جمع الشرائط و اہل بیت میں ہم زیادہ احق و افضل ہیں۔ اوصاف و فضائل کا قطعی فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ افضل و مفضول کے امتیاز کے لیے کوئی قطعی معیار ہوسکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ ہمیشہ کشت و خون کا بازار گرم رہتا اور امت کا نظام جمعیت کبھی نہ سدھرتا۔ پس ناگزیر تھا کہ خلافت قائمہ کی موجودگی میں ہر طرح کے دعوے کو بغاوت و جرم قرار دے دیا جائے اور اس کے لیے ایسی سزا تجویز کی جائے جو سخت سے سخت سزا ہوسکتی ہے یعنی قتل۔ ایک انسان کو قتل کردینا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ ہزاروں انسان قتل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حکم کی علت کی طرف واضح اشارہ کردیا گیا کہ "یرید ان یشق عصاکم"۔

یہ مضمون مختلف الفاظ و اسناد سے صحاح میں مروی ہے۔ ہم نے صرف ایک روایت پر اختصاراً اکتفا کیا ہے۔

اجماع امّت و جمہور فقہاء واعلام

اُمرائے بنوامیہ کی حکومت جبر واستبداد کے ساتھ قائم ہوئی اور اس وقت ایک جم غفیر صحابہ کرامؓ وائمہ اہل بیت نبوت کا موجود تھا۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گزر گئیں اور یہی زمانہ تمام علوم شرعیہ کی تدوین وترتیب کا ہے۔ تمام ائمہ واعلام اور فقہائے مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد ومسائل نے آخری ترتیب وتنظیم پائی۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی اعتقاد وعمل پر رہا۔ عقائد ضروریہ اور ارکان اربعہ کے بعد شاید ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم ویقینی اجماع وتعامل امت ثابت کیا جاسکے۔

صحابہ کرام وائمہ تابعین کا حال معلوم ہے۔ مروان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابوہریرہؓ مسجد نبوی میں موذن تھے۔ مروان کی عبادت سے بدذوقی کا یہ حال تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں کو شرکت کا موقع دینا بھی اس کی جلد بازی پر نہایت شاق گزرتا تھا۔ سورۃ فاتحہ ختم کرتے ہی بلاسکتہ کے قراۃ شروع کردیتا۔ حالانکہ احادیث میں آمین کہنے کی نہایت درجہ فضیلت وارد ہے۔ "فمن وافق تامینہ تامین الملائکہ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ۔ (بخاری) ابوہریرہؓ اس سے وعدہ لے لیتے۔ لاتفتنی بامین قرات میں ایسی جلد بازی نہ کرو کہ میری آمین ضائع جائے لیکن نماز اسی کے پیچھے پڑھتے اور اس کی اطاعت سے انکار نہ کرتے۔ (بخاری)

لوگ ان کی یاوہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ عید کے دن نماز کے بعد ہی مجمع منتشر ہوجاتا۔ خطبہ کا لوگ انتظار نہ کرتے۔ یہ حال دیکھ کر مروان نے ایک مرتبہ چاہا کہ عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تاکہ نماز کے انتظار کی وجہ سے لوگوں کو مجبوراً خطبہ سننا پڑے حالانکہ یہ صریح سنت کے خلاف تھا۔ سنت ثابتہ خطبہ عید کے بارے میں یہی ہے کہ نماز پہلے ادا کی جائے پھر خطبہ دیا جائے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اس پر فوراً ایک شخص نے ٹوکا اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے "من رای منکم منکراً فلیغیرہ" الخ والی روایت بیان کی۔

ایسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں۔ صحابہ کرامؓ نہایت بے باکی سے امر بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ ٹوکتے۔ لیکن خلیفہ انہی کو مانتے اور اطاعت انہی کی کرتے۔ کسی صحابیؓ نے بھی اطاعت

سے پہلے اس کی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر اس کی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی وشوری منتخب ہونا ہی مفقود تھا۔ باقی شرطیں تو سب اس کے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں۔

حضرۃ سید التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ کہا کرتے تھے۔ بنی مروان انسانوں کو بھوکا مارتے اور کتوں کو کھلاتے ہیں!! اور لوگ ان کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم وشدائد بھی سہتے مگر ساتھ ہی بہ حیثیت سلطان اسلام کے اطاعت بھی اُنہی کی کرتے۔

مامون و معتصم کے عہد میں بدعت اعتزال اور قول بہ خلق قرآن کی وجہ سے ایک فتنہ عظیم برپا ہوا۔ علماء سنت پر جو جو مظالم وشدائد ہوئے معلوم ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کوڑوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کرلیا اور مامون و معتصم کی دعوت بدعت کی پیروی نہ کی لیکن اطاعت کا مستحق انہی کو سمجھا اور اپنے نامہ وصیت میں لکھا تو یہی لکھا۔

والدعاء لائمة المسلمین بالصلاح ولاتخرج علیهم بالسیف ولاتقاتل هم فی الفتنة" كذا نقل عنه ابن الجوزی فی صیرة.

حافظ عسقلانی نے ابن التین کا ایک قول نقل کیا ہے۔ "**قد اجمعوا انه (ای الخلیفه) اذا دعا الی کفراوبدعة انه یقام علیه**" یعنی علماء نے اس پر اجماع کیا کہ اگر خلیفہ کفر اور بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا چاہیے۔ پھر اس قول کی نسبت لکھتے ہیں:

"مادعاه من الاجماع علی القیام فی ما اذا دعا الی البدعة مردود الا اذا حمل علی بدعة تودی الیٰ صریح الکفر والا لقد دعا المامون والمعتصم والواثق الیٰ بدعة القول بخلق القرآن وعاقبوا العلماء من اجلها بالقتل والضرب والحبس والواع الاهانة ولم یقل احد بوجوب الخروج علیهم بسبب ذلک ودام الامر بضع عشرة سنة حتی ولی المتوکل الخلافة فابطل المحنه (فتح ۱۳ :۱۰۳)

یعنی جو ابن التین نے کہا کہ اگر خلیفہ بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے تو یہ قول مردود ہے الا یہ کہ بدعت سے اس کا مقصود ایسی بدعت ہو جو صریح طور پر کفر تک پہنچ جاتی ہو کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مامون، معتصم، الواثق، تینوں خلیفوں نے بدعت خلق قرآن کی طرف دعوت دی اور اس کی وجہ سے علماء سنت کو طرح طرح کے مصائب وشدائد جھیلنے پڑے، قتل ہوئے، پیٹے گئے، قید کیے گئے لیکن پھر بھی کسی نے ان پر خروج واجب نہیں بتلادیا اور برابر ان کی اطاعت کرتے رہے حتیٰ کہ تقریباً دس برس تک یہی حالت رہی۔ خلیفہ متوکل نے تخت نشین ہو کر اس مصیبت کو دور کیا۔

انتہی۔

حقیقت یہ ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت واطاعت کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا عہد سلف کے مسلمانوں نے اس پر عمل کر کے دکھلا دیا کہ اس کا اصلی مفہوم ومقصد کیا ہے؟ وہ اپنے طرز عمل میں احکام خلافت کے ہر ٹکڑے اور ہر قسم کی ایک عملی تفسیر وشرح تھے۔ گذشتہ فصول میں ان احادیث پر نظر ڈال چکے ہیں جن میں آنے والے وقتوں کی نسبت امت کو احکام دیے گئے ہیں۔ خلافت راشدہ کا عہد فتنوں فسادوں سے محفوظ تھا لیکن اس کے بعد جو سلسلۂ خلافت شروع ہونے والا تھا وہ اپنے متضاد خصائص وحالات کی وجہ سے امت کے لیے ایک بڑی ہی سخت کش مکش اور ابتلا رکھتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں سیاہ بھی تھا اور سفید بھی، نور بھی تھا اور ظلمت بھی، حق بھی تھا اور باطل بھی۔ حب وبغض ہجر ووصل، ترک وطلب، اطاعت ومخالفت دونوں چیزیں ایک ہی وجود میں جمع ہو گئی تھیں۔ اور حکم شریعت یہ تھا کہ بہ یک وقت دونوں کو نبھاؤ اور اپنی اپنی جگہوں پر دونوں باتیں بجالاؤ۔ ایک طرف تو اس پر زور دیا گیا کہ وہ خلیفہ وامام ہیں اس لیے واجب الاطاعت ہیں۔ جب تک ان کے عمل سے کفر صریح ظاہر نہ ہو، ان کی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑو۔ دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ان کے اعمال اچھے نہ ہوں گے پس اطاعت کرو مگر پیروی واقتدا نہ کرو۔ برائیوں کی طرف بلائیں تو ہاتھ سے، زبان سے، دل کے اعتقاد سے، جس طرح بھی بن پڑے، پوری طرح مخالفت کرو اور ان کے قہر وتسلط سے دب کر حق کا ساتھ نہ چھوڑو۔ غور کرو! معاملہ کس درجہ کٹھن اور جذبات انسانی کے لیے کیسا پُر از امتحان تھا؟

انسان ایک وقت میں ایک ہی جذبہ کام میں لاسکتا ہے یا محبت کرے یا دشمنی۔ یا اطاعت کرے گا یا نافرمانی۔ جس کو اطاعت کا مستحق سمجھے گا اس کی ہر بات اس کی نظروں میں محبوب ہو جائے گی جس کو برا سمجھے گا...... اس کی فرمانبرداری بھی اس کے نفس کو گوارا نہ ہوگی۔ لیکن یہ وہ منزل عمل تھی جس میں ایک ہی وجود ممدوح ومذموم اور محبوب ومبغوض دونوں صورتیں رکھتا تھا۔ ایک ہی انسان کے آگے جھکنا بھی تھا اور پھر اسی کے سامنے سرکشی بھی کرنی تھی۔ البتہ جھکنے کا موقع دوسرا تھا، سرکشی کی گھڑی دوسری۔ جذبات وعواطف کے لیے سخت آزمائش اس میں آپڑی تھی کہ ہر جذبہ اپنے صحیح موقع پر کام میں لایا جائے ورنہ ذرا سی بے اعتدالی بھی سخت گمراہی وہلاکت کا موجب ہو جاتی۔ اطاعت کیشی میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ اقتداء اور تاسّی ہو جاتی جس کا نتیجہ باطل پرستی اور حق سے انحراف تھا۔ عدم اقتداء اور امر بالمعروف میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ خروج وبغاوت تک پہنچا دیتی، جس کا نتیجہ بدامنی وخونریزی ہوتا اور سخت معصیت وفسق کا وقوع۔ اس تیرہ سو برس میں کتنے ہی فتنے صرف اسی بے اعتدالی اور افراط وتفریط سے پیدا ہوئے، کتنوں ہی نے جوش حق پرستی میں بغاوت وخروج کر کے جمعیت امت واستحکام خلافت کو نقصان پہنچایا اور

کتنوں ہی نے افراط اطاعت کیشی میں حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کرامت کا نظامِ حق وعدل درہم برہم کردیا۔

دنیا میں کوئی قوم نہیں جس کے اجتماعی اعمال کی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر مل سکے کہ ایسے سخت ونازک حکم پر عمل کیا گیا ہو اور پوری کامیابی کے ساتھ اس کے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا گیا ہو۔ لیکن عہد صحابہ وسلف کے مسلمانوں نے صدیوں تک عمل کر کے ثابت کردیا کہ سچائی اور اخلاق کی کوئی عملی شکل ایسی نہیں جو پیروان اسلام کے لیے مشکل ہو۔ انہوں نے نہ صرف اس پر عمل کیا، بلکہ پوری کامیابی کے ساتھ اس اخلاقی امتحان سے عہدہ براہو کر نکلے۔ انہوں نے ایک ہی وقت میں دونوں متضاد عمل کر دکھلائے۔ اطاعت بھی کی اور مخالفت بھی لیکن اطاعت اسی بات میں کی جو مستحق اطاعت تھی اور مخالفت وہیں کی جہاں مخالفت کرنی تھی۔ ''اطاعت'' اور ''اقتداء'' کے اس نازک فرق کو جس کو فلسفۂ اخلاق بڑی بڑی دقیقہ سنجیوں کے بعد حل کرسکتا ہے، انہوں نے اپنی عملی زندگی کی سادگی سے حل کر دکھایا اور دنیا پر ثابت کردیا کہ اخلاق کے فلسفہ کے لیے جو چیز سب سے زیادہ مشکل ہے وہی ایک مومن کے عمل کے لیے سب سے زیادہ آسان ہے!

قومی حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے جو صحابہ وتابعین نے بنوامیہ کے امراء کی دور ظلم وجور میں کی! اور ان کے بعد علماء سلف نے بنوعباس کے دعاۃ بدعت کے زمانے میں کی! ہر طرح کے مظالم سہے۔ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں، قید کیے گئے، دڑوں سے مارے گئے، قتل ہوئے مگر پھر بھی اطاعت سے باہر قدم نہ رکھا اور ہمیشہ یہی کہتے رہے۔ ''ینصب لکل غادر لواء یوم القیامه ونحن بالعناهم'' وہ جو فرمایا تھا کہ ''قید شبر'' بالشت بھر اطاعت سے الگ نہ ہو، سو واقعی ویسا ہی عمل کر کے دکھادیا۔

مگر ساتھ ہی استقامت حق اور امر بالمعروف ودعوت الی السنۃ کا بھی یہ حال تھا کہ نہ تو عبدالملک کی بے پناہ تلوار اس پر غالب آسکتی تھی نہ حجاج کی خون آشامی اور نہ مامون ومعتصم کی قہرمانیت۔ قدم جب اٹھتا تھا تو حق کی طرف، زبان جب کھلتی تھی تو سچائی کے لیے اور دل میں کسی کی گنجائش نہ تھی مگر عشق کتاب وسنت کی۔ انہوں نے جس طرح اس حکم کی پیروی کی کہ:

''تسمع وتطيع وان ضرب ظهرک واخذ مالک فاسمع واطع رواه مسلم

ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس فرمان کی بھی کی کہ فان امر بمعصية فلاسمع ولا طاعة''

اور من رای منکم منکر فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه،[9] وان لم يستطع فبقلبه وذلک اضعف الايمان. (رواه مسلم)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی پیٹھ پر تو جلاد تازیانے مار رہے تھے۔ خود المعتصم سر پر کھڑا تھا۔ تمام پیٹھ سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے اور یہ سب کچھ صرف اتنی بات کے لیے ہو رہا تھا کہ قرآن کی نسبت ایک ایسے سوال کا جواب دے دیں جس کا جواب اللہ کے رسول اور اس کے اصحابؓ نے نہیں دیا ہے اور نہ دینے کا حکم دیا ہے۔ وہ سب کچھ سہہ رہے تھے مگر جواب نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی صدا نکلتی بھی تھی تو یہی نکلتی "اعطونی شیئا من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول" درّے مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ثابت کر دکھاؤ تو اقرار کرلوں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جس کے آگے اتباع و اقتداء کا سر جھک سکے۔

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

حواشی

۱؎ تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ۱: ۴۷

سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں

اسی طرح تمام ائمہ اہل بیت کا زمانہ خلفا بنوامیہ وعباسیہ کے عہدوں میں گزرا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو سمجھتے تھے نہ کہ بنوامیہ وعباسیہ کو۔ بایں ہمہ کسی نے بھی ان کے خلاف خروج نہ کیا اور نہ اطاعت سے انکار کیا۔ سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت ان کی قائم ہو چکی ہے، اس لیے سلطان وقت وہی ہیں۔

خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خروج کیا ائمہ نے برابر اپنی مخالفت ان سے ظاہر کی۔
جیسا کہ حضرت زید کے خروج اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے۔

حضرت امام علی رضا کو مامون الرشید نے اپنا ولی عہد قرار دیا۔ امام موصوف نے ولی عہدی قبول کر لی۔ یعنی تسلیم کر لیا کہ مامون خلیفہ ہے اور اس کو اپنے استخلاف اور ولی عہدی کا حق پہنچتا ہے اگر وہ خود خلیفہ نہ تھا تو دوسرے کو ولی عہدی کیونکر مل سکتی تھی!

ائمہ اہل بیت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنوامیہ وعباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو۔ برخلاف اس کے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ باوجود اظہار استحقاق خود و شکوہ غصب و تعدی وعدم اطاعت خروج سے ہمیشہ مانع رہے۔

سب سے زیادہ قاطع اور فیصلہ کن اسوۂ حسنہ اس بارے میں خود حضرت علی علیہ السلام کا ہے۔
حضرات امامیہ انکی خلافت کو منصوص تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انکی موجودگی میں اور کوئی جائز خلیفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بایں ہمہ ظاہر ہے کہ یکے بعد دیگرے تین خلیفہ ہوئے اور حضرت علیؓ نے نہ تو خروج کیا، نہ بیعت سے انکار کیا، نہ علیحدگی اختیار کی بلکہ متصل بیس برس تک ان کا یہی طرز عمل قائم رہا۔ اس سے بڑھ کر قاطع و فاضل دلیل اس بات کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب امت ایک سلطان پر مجتمع ہو جائے تو پھر کسی طرح بھی اس کی مخالفت جائز نہیں اور اس کی اطاعت کرنا ہر فرد پر واجب ہے؟ جب ایک خلیفہ وامام منصوص من اللہ کے لیے انکار جائز نہ تھا تو عامہ امت کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے؟

غرضیکہ اس بارے میں اہل سنت و امامیہ دونوں متفق ہیں۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح

ہوگئی کہ حضرات امامیہ اور اہلِ سنت میں مسئلہ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے، وہ صرف پہلی صورت میں ہے نہ کہ دوسری صورت میں۔ یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امت خلیفہ وامام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ اس کا استحقاق صرف ائمہ اہل بیت کو ہے وہی امام ہو سکتے ہیں۔ اہل السنۃ کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں۔

لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہوگیا ہو تو اس کی اطاعت پر جس طرح اہل سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں، ٹھیک اسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں۔ اہلِ سنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاءِ راشدین ہی میں جمع تھیں اور انہیں کا انتخاب صحیح نظام شرعی کے مطابق ہوا، ان کے بعد پھر نہ ہوا۔ امامیہ کے نزدیک ابتدا ہی سے نہ ہوا۔ لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی۔ شیعوں نے بھی ضروری قرار دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سنی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زیدیہ وغیرہ فرقوں کا ہے۔

بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ

تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے جو کتابیں پڑھی پڑھائی جارہی ہیں، ان سے بعض کی عبارتیں ہم نقل کریں گے۔

شرح مقاصد میں ہے:

"واما اذالم یوجد من یصلح ذلک' اولم یقدر علی نصبہ لاستیلاء اھل الباطل وشوکۃ الظلمۃ وارباب الضلال، فلاکلام فی جواز تقلید القضاوتنفیذالاحکام واقامۃ الحدود وجمیع مایتعلق بالامام من کل ذی شوکۃ"

اور شروط امام بیان کر کے لکھتے ہیں:

"نعم اذالم یقدر علے اعتبارالشرائط جازالابتناء للاحکام المتعلقۃ بالامامۃ علی کل ذی شوکۃ یقتدر تغلب اواسعولی"

اور اسی میں ہے:

"فان لم یوجد من قریش من یجمع الصفات المعتبرہ، ولی کنانی، فان لم یوجد، فرجل من ولد اسماعیل، فان لم یوجد فرجل من العجم."

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے:

"واماالخروج علیھم وقتالھم فمحرم وان کانوا فسقۃ ظالمین."

اور "حدیث من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد" کی شرح میں لکھتے ہیں

"ای لہ اھلیۃ الخلافۃ اوالتسلط والغلبہ"

شامی میں ہے۔

"ویثبت عقدالامامۃ اماباستخلاف الخلیفۃ ایاہ کمافعل ابوبکر، واما ببیعۃ جماعۃ من العلماء، اومن اھل الرائے".

مسامرہ میں ہے۔

"والمتغلب تصح منہ ھذالامور رای ولایہ القضاء والامارۃ والحکم بالاستفتاء ونحوھا) للضرورۃ، وصار الحال

عندالتغلب کمالم یوجد قرشی عدل، اووجد ولم یقدر (ای لم توجد قدرة علی تولیته لغلبة الجورة) ان یحکم فی کل من الصورتین بصحة ولایة من لیس بقرشی ومن لیس بعد ل للضرورة."

اورشرح مواقف میں امامت کی شرطیں بیان کرکے لکھتے ہیں:

"لکن للامة ان ینصبوا فاقدها، دفعاً للمفاسدالتی تندفع بنصبه" (۶۱۴)

سب سے زیادہ مشرح بحث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں کی ہے:

وقد اجمع الفقهاء علی وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه. وان طاعته خیر من الخروج علیه لما فی ذلک من حقن الدماء وتسکین الدهماء ولم یستثنوا من ذلک الا اذا وقع من السلطان الکفرالصریح، فلایجوز طاعته فی ذلک بل تجب مجاهدة لمن قدر علیها کما فی الحدیث" (جلد۱۳۔۷)

اورروایت حذیفہ۔"فاعتزل تلک الفرق کلها" الخ مندرجہ کتاب الفتن کی شرح میں لکھتے ہیں۔"قال ابن بطال :فیه حجة لجماعة الفقهاء فی وجوب لزوم جماعة المسلمین وترک الخروج علی ائمة الجور لانه وصف الطائفة الاخیرة بانهم دعاة علی ابواب جهنم مع ذالک امر بلزوم الجماعة" (۱۳۔۳۱)

اورحدیث"اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی" کی شرح میں لکھتے ہیں۔" واما لوتغلب عبد حقیقة بطریق الشوکة فان طاعته تجب اخماداً للفتنة" (۱۳۔۱۰۹)

حافظ نواوی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

"وهذا الاحادیث فی الحث علی السمع والطاعة فی جمیع الاحوال وسببها اجتماع کلمة المسلمین فان الخلاف سبب لفسادا احوالهم فی دینهم ودنیاهم وقوله صلعم:وان کان عبد مجدع الاطراف یعنی مقطوعها والمراد اخس العبید. ای اسمع واطیع للامیروان کان دنی النسب......ویتصورامارة العبد اذ ولاه بعض الائمة اویغلب علی البلاد بشوکته" الخ (جلد۲۔۱۲۵)

اورقاضی شوکانی درر البهیه میں لکھتے ہیں:

"وطاعة الائمة واجبة الا فی معصیة الله ولایجوز الخروج علیهم ما

اقاموا الصلوٰۃ" (شرح درر۔۳۱۴)

اور حجۃ اللہ البالغہ میں ہے۔"ان الخلیفۃ اذا انعقدت خلافتہ ثم خرج اخر ینازعۃ حل قتلہ."

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلہ خلافت وحقیقت خلافت پر کرتے ہوئے (جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے) لکھتے ہیں۔

"وحرام ست خروج بر سلطان بعدازاں کہ مسلمین بروے جمع شوند، مگر آنکہ کفر بواح از وے دیدہ شود، اگر چہ آں سلطان مستجمع شرائط نہ باشد وایں مضمون متواتر بالمعنی ست۔" (جلد۱۔ص۱۳۷)

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گزر چکا۔ یعنی ہر زمانے میں امت کے لیے ایک خلیفہ ہونا چاہیے جو صاحب طاقت واقتدار ہو۔ اگر امت منتخب کرے تو اس کے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں۔ لیکن اگر کسی مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور وہی صاحب اقتدار وشوکت ہے تو اسی کو خلیفہ ماننا چاہیے۔ خواہ تمام شرطیں اس میں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں۔ قرشی ہو یا غیر قرشی، ظالم ہو یا عادل، عالی خاندان ہو یا دُنی المنسب حتیٰ کہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی اطاعت وحمایت ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جب تک کفر صریح اس سے ظاہر نہ ہو لیکن اگر ایسا ہوا، تو پھر نہ بیعت قائم رہی نہ عہد اطاعت باقی رہا۔ اس حالت میں مسلمانوں پر واجب ہو جائے گا کہ اس کا مقابلہ کریں۔ جو شخص مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہ دیکھے، وہ اس کے ملک سے ہجرت کر جائے۔"فمن قام علی ذلک فلہ الثواب ومن اھن فعلیہ الاثم ومن عجز وجبت علیہ الھجرۃ من تلک الارض" کذا فی الفتح (۱۳. ۱۰۹)

فتح الباری کی اس عبارت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ جس ملک میں کفار کی سلطنت قائم ہو جائے، وہاں مسلمان کو خروج کرنا چاہیے اور حق کے اظہار واعلان میں کسی طرح کی مداہنت گوارا نہ کرنی چاہیے۔ لیکن اگر اس کی طاقت اپنے اندر نہ دیکھیں تو پھر اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔ یعنی یہ کسی حال میں جائز نہیں کہ تسلط کفر پر قانع ورضامند ہو کر زندگی بسر کریں۔

حکم حمل سلاح علی المسلم
من حمل علینا (الخ)

سورہ نساء میں ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَاَعَدَّلَهُ عَذَاباً عَظِيْماً. (۴:۹۳)

جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ کی ہیشگی ہے اللہ کا غضب ہے، اس کی پھٹکار ہے اور بڑا ہی دردناک عذاب ہے جو اس کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے اور ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی حق شرعی کے دوسرے مسلمان کو قتل کرے وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ کے غضب و لعنت کا مورد ہوگا اور عذاب الیم کا مستحق۔

بخاری و مسلم میں ہے۔ ''سباب المسلم فسوق وقتاله کفر" رواه الترمذی وصححه ولفظه. "قتال المسلم اخاه كفر وسبابه فسوق "۔ یعنی: مسلمان کو دشنام دینا فسق ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقع پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا اور جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، اس میں ہمیشہ کے لیے تمام امت کو وصیت فرمائی۔ ''لاترجعوا (وفی روایة لاترجعون) بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن اڑائے۔

اور بخاری میں حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے لایشیر احدکم علی اخیه بالسلاح فانه لایدری لعل الشیطان ینزع فی یده (وفی روایه ینزع بالعین) "فیقع فی حفرة من النار" (وایضاً اخرجه مسلم عن ابن رافع، وابونعیم فی المستخرج من مسند ابن راهویه)

یعنی فرمایا۔ کبھی اپنے بھائی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو ممکن ہے کہ ہتھیار لگ جائے اور تم جہنم کے گڑھے میں گر پڑو۔ یعنی اگر اشارہ کرنے میں تلوار کام کر گئی اور مسلمان کا خون ہو گیا تو

ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے گا جس کی پاداش عذاب جہنم ہے۔

اور ابن ابی شیبہ نے ابوہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ "الملائکة تلعن احدکم اذا اشار الی الاخر بحدیدة وان کان اخاه لابیه وامه" اور امام ترمذی نے ایک دوسری اسناد سے موقوفاً روایت کیا ہے۔"من اشار الی اخیه بحدیده لعنه الله والملائکه" (قال حسن صحیح غریب) وکذا اصحه ابوحاتم من هذالوجه، یعنی فرمایا جب کبھی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے تو اللہ اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

فتح الباری میں ہے۔قال ابن العربی اذااستحق الذی یشیر بالحدیدة اللعن، فکیف الذی یصیب بها؟ وانمااستحق اللعن اذا کانت اشارة تهدیداً سواء کان جاداام لاعباً (جلد۱۳۔۲۱)

یعنی ابن العربی نے کہا: جب صرف ہتھیار اٹھا کر اشارہ کرنے کی نسبت ایسی شدید وعید آئی کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں تو اس بدبخت کا کیا حال ہوگا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے بلکہ سچ مچ اپنے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر ڈالے اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہوتا ہے تو اس سے مقصود وہی شخص ہوگا جو ڈرانے کے لیے ایسا کرے خواہ غصہ سے ہو خواہ ہنسی مذاق سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی سے بھی کوئی شخص ہتھیار اٹھا کر کسی مسلمان کو ڈرائے تو وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔یعنی کسی حال میں بھی یہ بات مسلمانوں کے لیے جائز نہیں اور یہ فعل اس درجہ شریعت کے نزدیک مبغوض ہے کہ اس کی ہنسی دل لگی بھی لعنت کا موجب ٹھہری۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً مروی ہے۔"زوال الدنیا کلهااهون علی الله من قتل رجل مسلم (اخرجه الترمذی وقال حدیث حسن (اخرجه النسائی ولفظه" لقتل المومن اعظم عندالله من زوال الدنیا) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے زائل ہو جانے سے بھی بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مسلمان کا قتل ہوتا ہے اور اسی بنا پر فرمایا"اول ما یقضی بین الناس فی الدماء (رواه البخاری عن ابن مسعود وزاد مسلم" فی یوم القیمة" قیامت کے دن سب سے پہلے جس کا معاملہ چکایا جائے گا وہ انسان کا خون ہے!

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو آپ نے فرمایا"تزود من الماء البارد فانک لن تدخل الجنة "(رواه البیهقی) بن پڑے تو اچھی طرح ٹھنڈا پانی ساتھ لے کر چل کیونکہ تیرا ٹھکانہ دوزخ ہے تو یقیناً جنت میں نہ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہوسکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔

شریعت نے مسلمانوں کی جمعیت وقومیت کی بنیاد باہمی مواخات پر رکھی ہے یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا رشتہ ہے۔

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا(۳:۱۰۳) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (۴۹:۱۰)

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں پس جب دو بھائیوں میں رنجش ہوجائے تو صلح کرادو، مسلمانوں کی قومی سیرۃ جابجا یہ بتلائی (اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵:۵۴) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ) (۴۸:۲۹) ان میں جس قدر بھی نرمی ہے مسلمانوں کے ساتھ ہے جس قدر بھی سختی ہے غیروں کے ساتھ ہے۔ وہ سب سے زیادہ نرم بھی ہیں اور سب سے زیادہ سخت بھی۔ نرم اپنوں کے لیے، سخت غیروں کے لیے۔ ان کے پاس محبت بھی ہے، عداوت بھی۔ لیکن محبت پرستارانِ حق کے ساتھ کرتے ہیں اور عداوت دشمنانِ حق کے ساتھ۔

احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات وتمثیلات ملتی ہیں وہ مشہور ومعلوم ہیں اور مہاجرین وانصار اور عموم صحابہ کرامؓ نے ان کی عملی تصویر بن کر ہمیں بتلادیا ہے کہ اخوت دینی کے معنی کیا ہیں؟ ہر مسلمان پر اس کی نماز اور روزہ سے بھی بڑھ کر جو چیز فرض کردی گئی وہ یہی ہے کہ مسلمانوں سے محبت کرے، جہاں تک بن پڑے ان کی بھلائی چاہے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے کسی مسلمان کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو ایمان واسلام بھی نہیں۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد وعبادت ہو اور سمندر جتنی دولت بھی خرچ کرڈالی جائے لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بیکار وعبث ہے۔

فرمایا ''لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ'' (رواہ الشیخان) کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہوجائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے، وہی اپنے بھائی مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔

اور فرمایا ''لاتدخلون الجنۃ حتی تومنوا ولاتومنون حتی تحابوا'' تم کبھی جنت میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک ایمان نہ لاؤ اور کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک آپس میں محبت و پیار نہ کرو۔

اور فرمایا ''لاتحسسوا ولاتجسسو ولا تناجشوا، ولا تباغضوا، ولاتدابروا ولاتنابزوا وکونوا عباداللہ اخوانا،، (شیخان) ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، باہم کینہ اور عناد نہ

رکھو، بدگوئی نہ کرو اور ایسا کرو کہ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حضرت جابرؓ کو وصیت کی "ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبک غش لاحد" (مسلم) تجھ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اس کی کرنوں کی طرح تیرا دل بھی صاف ہو اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کی طرف سے تیرے اندر کھوٹ نہ ہو۔

اور فرمایا "المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده (بخاری) مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اور فرمایا۔ "المسلم اخو المسلم، لایظلمه ولایخذله، ولایحقره" (مسلم)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے پس اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو ظلم کرے نہ اسے ذلیل کرے، نہ اس کو حقیر جانے۔

اور فرمایا۔ "لایحل لرجل ان یهجر اخاه فوق ثلاث (شیخان) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے۔

اور فرمایا ملعون من ضار مومنا اومکربه (ترمذی) اللہ کی اس پر پھٹکار جس نے مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اس کو دھوکا دیا۔

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ "من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلایحد النظر الی اخیه،، (رواہ الحاکم وصححه) جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف تیز نظروں سے گھورے۔ یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے تو محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھے۔

پس جب اللہ کی شریعت حقہ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت و برادری پر رکھی، اسی کو ایمان کی جڑ قرار دیا۔ وہی اسلام کی اصلی پہچان ہوئی، اسی پر ایمان کی تکمیل موقوف ٹھہری تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے ہوئے رشتے کو توڑ دے اور اپنے انہی ہاتھوں سے جو مسلمان کی دستگیری و مددگاری کے لیے بنائے گئے تھے، مسلمانوں کی گردنیں کاٹے، اس سے بڑھ کر خدا کی زمین پر اس کی شریعت کا کون مجرم ہو سکتا ہے؟ اور اگر انسان کی برائیاں اور بدعملیاں اللہ کی لعنت کی مستحق ہو سکتی ہیں، تو اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو اللہ کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی بوندوں کی طرح آسمانوں سے زمین پر برسنے لگیں۔

جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ بتلائے، اسی کا خون اور خود ایک مسلمان کے ہاتھوں بہے! اس سے بڑھ کر شریعت الٰہی کی

کیا توہین ہو سکتی ہے؟ اور ان سارے گناہوں میں جو انسان کے ہاتھ پاؤں کر سکتے ہیں۔ کونسا گناہ ہے جو اس سے زیادہ ملعون و مردود ہو سکتا ہے؟

دنیا کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ سے بڑھ کر خدا کی نظروں میں عزت رکھتی ہو؟ اور کونسی محبوبیت ہے جو اس کلمہ عزیز کے اقرار کرنے والے کو اللہ کے حضور نہیں مل جاتی! پس جس بدبخت کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ ہو جائے کہ باوجود دعوئے اسلام مسلمانوں کا خون بہانے لگے، وہ یقیناً مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا بلکہ اللہ کے کلمہ توحید کو ذلیل و خوار کرنا اور اس کی عزت و جلال کو بٹہ لگانا چاہتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوالحرقہ کی طرف ایک فوجی مہم دے کر بھیجا تھا۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا ساتھ ہی ایک انصاری بھی حملہ آور ہوا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اس کے سر پر چمکی تو وہ پکار اٹھا "لا الہ الا اللہ" میں نے کچھ پرواہ نہ کی اور قتل کر ڈالا۔ لیکن کلمہ کی صدا سن کر انصاری نے تلوار روک لی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو نہایت ناراض و غمگین ہو گئے اور فرمایا "اقتلته بعدما قال لا اله الا الله"؟ تو نے اسے قتل کر دیا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا؟ میں نے عرض کیا انما کان متعوذا وہ تو اس نے محض میری تلوار سے بچنے کے لیے کہہ دیا تھا فی الحقیقت مسلمان نہیں ہوا تھا۔ "فمازال یکررھا علی حتیٰ تمنیت انی لم اکن اسلمت قبل ذالک الیوم" لیکن آنحضرتؐ برابر یہی جملہ دہراتے رہے تو نے قتل کر ڈالا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا۔ یہاں تک کہ آنحضرت کا حزن وملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھ کر مجھے اس قدر ندامت ہوئی کہ دل نے کہا، کاش آج کے دن سے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے: "افلا شققت عن قلبه حتی تعلم" تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں۔ یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اس کا احترام واجب ہو گیا۔ خواہ تلوار کے ڈر سے کہا ہو یا سچ مچ دل سے اقرار کیا ہو۔ دل کا حال تو صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یہی واقعہ صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اس میں بعض زیادات ہیں۔ وفیه ان النبی صلعم قال له "فکیف تصنع بلااله الا الله اذا اتتک یوم القیامه؟ قال یارسول الله استغفرلی." قال فکیف تصنع بلااله الا الله؟" فجعل لا یزیده علی ذلک یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ سے کہا "قیامت کے دن جب لا الہ الا اللہ کے ساتھ وہ تیرے سامنے آئے گا تو اس وقت تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ کو کیا جواب دے گا؟ اسامہ نے

عرض کیا یارسول اللہ اب تو مجھ سے یہ قصور ہو گیا۔ میری بخشش کے لیے دعا کیجئے۔ لیکن آنحضرتؐ یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کا جب دعویٰ ہوگا تو تم کیا جواب دو گے؟ اور اس جملہ کے سوا کوئی بات نہ فرمائی۔

بخاری میں ہے کہ آپ سے مقداد بن عمرو الکندی نے پوچھا۔''ان لقیت کافراً فاقتتلنا، فضرب یدی بالسیف فقطعها، ثم لاذ بشجرة وقال اسلمت الله اافقتله بعد ان قالها؟'' اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ ہو اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اس طرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے۔ پھر الگ ہو کر کہے، میں اللہ پر ایمان لایا، تو یہ کہنے کے بعد اسے قتل کردوں یا نہ کروں؟ فرمایا ''لاتقتله'' مت قتل کر۔''قال فانه طرح احدی یدی ثم قال ذلک بعد ماقطعها'' مقداد نے عرض کیا اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ ڈالا اور اس کے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا پھر کیوں نہ میں اس سے اپنا بدلہ لوں۔ فرمایا۔ ''لاتقتله، فان قتلته، فانه بمنزلتک قبل ان تقتله، وانت بمنزلته قبل ان یقول کلمة التی قال''. جو کچھ بھی ہوا ہوا، لیکن جب کلمہ توحید کا اقرار کرلیا تو پھر قتل نہ کر اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا اور تو مسلمان، لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائے گا اور تو اس کی جگہ۔

یہ دو روایتیں اس بارے میں نہایت ہی عبرت انگیز ہیں۔ جب اللہ کے رسول کا یہ حال تھا کہ ایک مشرک دشمن کا جنگ کی حالت میں بھی قتل ہو جانا گوارا نہ ہوا کیونکہ اس نے خوف جان سے ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا اور اس پر اس قدر رنج و افسوس فرمایا کہ عرصہ تک صدائے الم زبان مبارک سے نکلتی رہی، تو پھر غور کرو کہ جو مسلمان ان مسلمانوں کو قتل کرے جن کی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوئی ہیں اور جنہوں نے محض خوف جان سے ایک مرتبہ ہی نہیں بلکہ دل کے یقین و ایمان سے لاکھوں مرتبہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار اور ورد کیا ہے اس کی شقاوت و خسران کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو ایک مسلمان کے لیے عذاب الیم کا مستوجب ہو؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس فعل کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی۔ یعنی فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ (۴:۹۳) اس میں خلود فی النار غضب، لعنت، تین چیزوں کا ذکر کیا ہے اور تمام قرآن و سنت میں یہ تینوں کلمات وعید کفار کے لیے مخصوص ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت کہیں استعمال نہیں کیے گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام معاصی و فسوق سے اس فعل کی برائی کہیں زیادہ ہے۔ کفر صریح و قطعی کے بعد اور عام معاصی سے اشد، کوئی فعل ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے اور اسی لیے تمام احادیث میں اس فعل کو کفر فرمایا کہ ''وقتله کفر'' اور لاترجعوا بعدی

کفارا" معصیت وفسوق کا لفظ اس کی ناپاکی وملعونیت ظاہر کرنے کے لیے کافی نہ تھا جب مسلمان کو صرف دشنام دینا فسق ہوا کہ سباب المسلم فسوق" تو پھر اس کو قتل کر دینا صرف فسق ہی کیوں ہو؟

ثانیاً جس طرح ایمان واسلام کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے۔"الایمان بضع وسبعون شعبۃ اعلاھالاالہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الا ذی عن الطریق." (رواہ مسلم واصحاب السنن الثلاثہ ورواہ البخاری "بضع وستون") اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ وادنیٰ مراتب ہیں جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے اور اسی لیے صحابہ وسلف سے مروی ہے و کفر دون کفر "وظلم دون ظلم" [1] اور پھر جس طرح ایمان واسلام اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی۔ یعنی اعتقادات ومعنویات میں بھی ہے اور عملیات وظواہر میں بھی۔ فکر میں بھی ہے اور فعل میں بھی، ایمان باللہ والرسل بھی اسلام ہے اور نماز بھی اسلام ہے۔ ٹھیک اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر ونفاق اعتقادات وافکار کا ہے۔ ایک اعمال وافعال کا۔ شرک کفر اعتقادی ہے اور ترک صلوۃ عمداً کفر عملی۔ پس یہ جو فرمایا کہ "سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر اور فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (۴:۹۳) اور "لاترجعوا بعدی کفارا" اور "فلیس منا" تو ان میں اور عموم احکام کفر واسلام میں کوئی تعارض نہیں۔ نہ لفظ "کفر" کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ نفی اسلام کو نفی کمال پر محمول کرنے کی ضرورت ہے۔ شارع نے جس فعل کو کفر کہا، وہ کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے اور کفر ہی رہے گا۔ البتہ یہ کفر بھی مثل دیگر اعمال کفریہ کے عملی کفر ہے، نہ کہ کفر اعتقادی ومخرج عن الملت۔ اس کا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسے نماز چھوڑ دینے والا مسلمان جس کے کفر پر صحابہ کرام کو اتفاق تھا۔ "وکان اصحاب رسول اللہ صلعم لایرون شیئا من الاعمال ترکہ کفر غیرالصلوۃ" (ترمذی) "من الاعمال" کی قید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے وہ بات ترک صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی لیکن بلاشبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو مخرج عن الملت ہے۔ جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اس معنی میں کافر نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴:۴۸) اور حدیث ابوسعید خدریؓ کہ اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من الایمان (رواہ البخاری)

پس اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانا شریعت کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً

کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی برائی نہیں اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ کتاب و سنت میں جن جن لفظوں اور وعیدوں کو امتناع کے جیسے جیسے پیرایوں میں اس فعل کا ذکر کیا ہے وہ عام معاصی و فسوق کے لیے کبھی اختیار نہیں کیے گئے اور وہ ایسے سخت و شدید ہیں کہ جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزا دینے اور خوف الٰہی سے بدحال کر دینے کے لیے بس کرتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مُردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جا سکتے ہیں اس سے سرزد ہو جا سکتے ہیں مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان نہیں کر سکتا۔

قرآن میں "لعنت" اور "غضب" کا لفظ کفار و منافقین کے لیے مخصوص ہے۔ لعنت کے معنی یہ ہیں کہ رحمت الٰہی سے مجبوری اور ہر طرح کی کامیابیوں سے اور فلاح سے محرومی۔ یہودی ملعون و مغضوب ہوئے اور عزت و حکومت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ سورہ احزاب میں منافقین پر لعنت وارد ہوئی۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" (۳۳:۵۷) چنانچہ وہ سب نابود و مخذول ہو گئے چونکہ ایمان و اسلام کے خصائص بالکل اس سے متضاد ہیں۔ وہ رحمت الٰہی کا مورد اور فلاح و مراد کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا جہاں ایمان ہو وہاں لعنت الٰہی کا بھی ورود ہو سکے۔ احادیث میں جا بجا ایسے واقعات ملیں گے کہ سخت سے سخت معاصی و فسوق کا جن لوگوں سے ارتکاب ہو گیا تھا ان پر بھی لعنت کرنے سے آنحضرتؐ نے روکا۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے۔ "مایکرہ من لعن شارب الخمر" یعنی جو مسلمان شراب پینے کی معصیت میں مبتلا ہو جائے اس پر لعنت کی ممانعت۔ اس میں عبداللہ ملقب۔ "بہ الحمار" کا واقعہ بہ روایت حضرت عمرؓ لائے۔ یہ شخص بار بار شراب نوشی کے جرم میں ماخوذ ہو چکا تھا۔ سزائیں پاتا تھا، توبہ کرتا تھا، پھر مبتلا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب ماخوذ ہوا تو بعض مسلمان بول اٹھے۔ "اللھم العنہ ما اکثر مایوتی بہ" اس پر خدا کی لعنت ہو۔ لیکن آنحضرتؐ نے نہایت سختی سے روکا۔ "لاتلعنوہ" (وفی لفظ لاتلعنہ) فواللہ ماعلمت انہ یحب اللہ ورسولہ (وفی روایۃ) فانہ یحب اللہ ورسولہ) اس پر لعنت نہ بھیجو۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبدالبر کا قول نقل کیا ہے۔ "انہ اتی بہ اکثر من خمسین مرۃ" فتامل!

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت مندرجہ کتاب الدیات بخاری ہے کہ ایک شخص اسی جرم میں ماخوذ ہوا اور اس کو پیٹنے کا حکم دیا گیا۔ کسی نے کہا "اخزاک اللہ" خدا تجھے رسوا کرے فرمایا لاتقولوا ھکذا۔ لاتعینوا علیہ الشیطان" اور سنن ابوداؤد میں ابن وہب کے طریق سے ہے ولکن

قولوا اللھم اغفرلہ. اللھم ارحمہ" بددعا نہ دو بلکہ یوں کہو خدایا اس پر رحم کر، خدایا اسے بخش دے۔ قلت وما اصلح فی ھذا المقام قول الشاعر العارف۔

فدائے شیوہ رحمت، کہ در لباس بہار
بعذر خواہی رندان بادہ نوش آمد

لیکن صرف قتل مسلم ہی ایک ایسی معصیت ہے جس کے لیے قرآن نے "لعنت" اور "غضب" کے الفاظ استعمال کیے اور احادیث میں بھی جا بجا لعنت و ملعون کا لفظ وارد ہوا۔ صرف اسی ایک بات سے فیصلہ کرلو۔ خواہ یہ فعل کفر قطعی و مخرج عن الملت ہو یا نہ ہو، لیکن اللہ کی شریعت کے نزدیک اس کا ارتکاب کس درجہ مبغوض و ملعون ہے؟ اور جو مسلمان اس کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے حضور کس طرح اپنے اسلام و ایمان کی ساری رحمتیں اور برکتیں کھو دیتا ہے۔

ثالثاً اس باب میں فیصلہ کن حدیث وہ ہے جس کو ہم نے بہ اتباع تبویب بخاری، اس فصل کا عنوان قرار دیا ہے اور جس کو امام موصوف اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا یعنی "من حمل علینا السلاح فلیس منا" (رواہ ابن عمر، وسلم، وابوموسیٰ الاشعری، وفی روایت سلمہ من سلّ علینا السیف) جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ ومعنی الحدیث حمل السلاح علی المسلمین لقتالھم بہ بغیر حق" (فتح ۱۳۔ ۲۰)

یہ حدیث نہایت اہم ہے اور من جملہ قواعد و کلیات شریعت کے ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے کتاب الفتن میں ایک خاص عنوان کا باب قرار دیا اور امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان و کفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں اور حافظ نووی نے ایک مستقل عنوان قرار دے کر باب باندھا۔

"لیس منا" کے معنی ہیں "ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کے طرز تکلم و خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ولیس منا" وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے۔ جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کسی ایسی حالت کا بتلانا مقصود ہوتا تھا۔ عام معاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے حالت کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو جو اوپر گزر چکی، تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔ پس کچھ ضروری نہیں ہے کہ "لیس منا" کے یہ معنی کیے جائیں کہ "لیس علی ھدینا" یا ظاہر منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور تاویل کی جائے یا نفی کو نفی کمال پر محمول کیا جائے۔

صاحب شریعت نے جن کاموں کے لیے جو جو احکام دیئے اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں

ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل وتوجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور واثر گھٹانے کی کوشش کریں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں انہوں نے مسلمانوں کو اسلام وایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو آج تمام عالم اسلام میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً یک قلم مرجی وجہمی زندگی بسر کر رہے ہیں اگرچہ اعتقاداً اہل سنت ہونے کا دعوے کرتے ہیں اور اسلام کی تعریف میں "عمل بالارکان" کا لفظ صرف درسی کتب عقائد کے صفحات پر رہ گیا ہے، عمل میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا، تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی بدعت تاویل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت ومطلوبیت بالکل جاتی رہی اور ادعاء اسلام کا سارا دارومدار صرف چند جزئیات عقائد کے تحفظ ونزاع پر رہ گیا۔ یہ کیا بات ہے کہ ایک شخص کتنا ہی فاسق وفاجر ہو، لیکن اگر چند نزاعی عقاید میں ہمارا ہم داستان ہوتا ہے تو ہم اس کو دنیا کی سب سے بہتر مخلوق یقین کرتے ہیں؟ اور ایک شخص کتنا ہی صاحب عمل وصلاح ہو، لیکن اگر چند اختلافی جزئیات عقائد میں ہم سے متفق نہیں تو پھر اس سے زیادہ شرالبریہ ہماری نظروں میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ وہی عملی مرجیت و جہمیت اگرچہ زبان سے ادعاء اتباع سنت وسلف!

یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رائے اور تعمق کی بدعتوں تک لے جانے والی تھیں۔ اسی حدیث کی نسبت امام نووی اور حافظ عسقلانی وغیرہما لکھتے ہیں "وکان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ لیس منالیس علی ھدینا، ویقول بئس ھذاالقول. یعنی بل یمسک عن تاویلہ" (شرح مسلم مطبوعہ احمدی. ۶۹ وفتح الباری ۱۳ . ۲۰) یعنی سفیان بن عیینہ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ لیس منا کی تفسیر یوں کی جائے کہ "لیس علی ھدینا" اور اس تفسیر کی نسبت کہا کرتے کہ کیا ہی برا قول ہے۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ ان نصوص کی تاویل نہ کرنی چاہیے۔

اسی طرح شیخ عبدالوہاب شعرانی نے میزان میں امام سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے۔

"ومن الادب اجزاء الاحادیث التی خرجت فخرج الزجر والتنفیر علی ظاھرھا من غیر تاویل، فانھا اذا اولت، خرجت من مراد الشارع، کحدیث: من غشنا فلیس منا، ولیس منا من لطم الخدود وشق الجیوب ودعی بدعوة الجاھلیہ فان العالم اذا اولھا بان المراد لیس منافی تلک الخصلة فقط' ای وھو منا غیرھا، ھان علی الفاسق الوقوع فیھا وقال مثل المخالفة فی خصلة واحدة امر سھل."

"لیس منا" کے صاف معنی یہ ہیں کہ "وہ ہم میں سے نہیں"۔ یعنی مسلمانوں میں سے نہیں اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ وقتال کے ہتھیار اٹھانا ایک ایسا فعل ہے جس کے کرنے کے

بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

حواشی

لے یہاں یہ شبہ وارد نہ ہو کہ یہ حدیث محاسبہ صلوٰۃ مشہور حدیث سے معارض ہے کیونکہ نماز کی نسبت قضا کا لفظ نہیں آیا۔ حساب کا آیا ہے بخاری کی روایت میں ہے **اول مایحاسب به المرء صلاته** قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے۔ لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائے گا۔ ان میں سب سے پہلا معاملہ خون کا ہوگا۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ چنانچہ نسائی نے یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی متن واسناد سے روایت کیے ہیں:

"اول مایحاسب به العبدالصلوة و اول ما یقضی بین الناس فی الدماء"

امام بخاری نے مندرجہ متن حدیث ابن مسعودؓ سے بطریق اعمش عن ابی وائل روایت کی ہے اور منجملہ ثلاثیات بخاری کے ہے۔ نسائی بھی یہ روایت ابو وائل کے طریق سے لائے ہیں۔ پس سنداً و متناً روایت ایک ہی ہوئی۔ باقی رہا محاسبہ و قضاء کا فرق تو وہ بالکل ظاہر ہے بعض اعمال انسان کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں بعض دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی قسم کے کاموں میں قضا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر شخص کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی دوسرا النفس مدعی نہیں ہوتا البتہ پرسش ہوسکتی ہے کہ وہ فرائض انجام دیے گئے یا نہیں؟ لیکن دوسری قسم کے لیے پرسش کافی نہیں۔ فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایسے کام ہیں جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوئے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی کے کھڑے ہوں گے۔ نماز پہلی قسم کے اعمال میں سب سے زیادہ اہم ہے اور قتل نفس کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ پس جب حساب ہوگا تو سب سے پہلے نماز کی نسبت پوچھا جائے گا اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب سے پہلے قتل نفس کا معاملہ پیش ہوگا۔

۲ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا۔ **"کفر ان العشیرۃ و کفر دون کفر"** لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرامؓ کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء بن ابی رباح وغیرہ کے طرق سے روایت کیا ہے اور امام ابوالحسن اشعری نے بھی مقالات طوائف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ یہ قول متعدد صحابہ سے منقول ہے اور سلف میں عام طور پر زبان زد تھا۔ **کمانقل عنه شیخ الاسلام ابن تیمیه فی کتاب**

الایمان

۳؎ احادیث میں بعض اعمال کی نسبت "لیس منا" آیا ہے اور بعض کی نسبت " لیس منی" جیسے "النکاح من سنتی فمن رغب عنها فلیس منی" دونوں میں فرق ہے۔ لیس منا" میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود امت ہے۔ اور لیس منی میں اپنی ذات خاص کا ذکر ہے جس سے مقصود ترک سنت ہے۔ پس جن احادیث میں لیس منا کی وعید آئی ہے ان سے مقصود وہی ہوگا جو متن میں لکھا ہے اور جن میں لیس منی ہے ان سے مقصود صرف ترک اتباع سنت واسوہ نبوت ہوگا۔

اقسام ثلاثہ قتل مسلم وحمل سلاح

البتہ واضح رہے کہ قتل مسلم حمل سلاح کی متعدد صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم شرعی دوسرے سے مختلف ہے۔

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے، لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے۔ اس کی حرمت کا معترف ہو اور اس کے ارتکاب پر شرمندہ ومتاسف تو اس کا حکم وہی ہے جو گزشتہ فصل میں گزر چکا۔ یعنی وہ عملی کفر ہے مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہیں ہو جائے گا۔ دنیا میں اسلام کے قومی احکام ومعاملات اس پر جاری ہوں گے۔ عاقبت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قاتل مسلم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں خود صحابہ وسلف سے اختلاف منقول ہے۔ ایک جماعت اس طرف گئی کہ سورہ فرقان میں ہے :وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (۲۵:۶۸) الخ پھر فرمایا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ"(۲۵ : ۷۰)

پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام معاصی کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہو سکتی ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بخاری ومسلم وغیرہما میں مروی ہے جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے، اس کی توبہ مقبول نہیں۔ وہ فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا کے یہی معنی کرتے ہیں کہ "لاتوبہ لہ" اور صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس سے " الا من تاب " کی نسبت پوچھا گیا تو کہا "ھذہ مکیہ نسخھا ایۃ مدنیۃ التی فی النساء" یعنی اس آیت کو سورہ نسا کی آیت من یقتل مومنا' نے منسوخ کر دیا۔ پس قبولیت توبہ پر اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے۔ "لما انزلت التی فی الفرقان قال مشرکوا مکۃ قد قتلنا النفس ودعونا مع اللہ الہ اخر واتینا الفواحش. فنزلت الا من تاب وامن. الخ. قال فھذہ لاولئک واما التی فی النساء فھو الذی قد عرف الاسلام ثم قتل مومنا متعمدا، فجزاء ہ جھنم لا توبہ لہ یعنی جب سورہ فرقان کی آیت وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ (۲۵ :۶۸) اتری تو مشرکین مکہ نے کہا ہم تو یہ سب کام کر چکے ہیں اب مسلمان ہوئے بھی تو نجات کب

ملے گی؟ اس پر آیت اتری کہ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ.(۲۵:۷۰) یعنی ہاں لیکن جس شخص نے توبہ کی، ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو اللہ اس کی برائیوں کو محو کردے گا۔لیکن "من یقتل مومنا" والی آیت مشرکین کے لیے نہیں مسلمانوں کے لیے اتری ہے یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مسلمان کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے توبہ نہیں۔ انتھی۔

اور امام احمد وطبرانی نے سالم بن ابی الجعد سے بطریق یحیی الجابر اور نسائی وابن ماجہ نے بطریق عمار ذہبی روایت کی ہے۔ ایک شخص نے ابن عباس سے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا "لقد نزلت فی آخر مانزل ومانسخها شئی حتی قبض رسول الله صلی الله علیه وسلم ومانزل وحی بعد رسول الله" اس پر سائل نے کہا "افرایت ان تاب وامن و عمل عملاً صالحاً ثم اهتدیٰ؟ کہا "وان له التوبة والهدی؟ یہ لفظ یحیی الجابر کا ہے۔ نسائی وابن ماجہ کے الفاظ بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ حاصل ان تمام روایات کا یہ ہوا کہ ابن عباس سورہ فرقان کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں آخر تنزیل سورہ نساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا" (۴:۹۳) ہے اور اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل مسلم کے لیے توبہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے قوی نظر آتا ہے۔

اول تو اس بنا پر کہ سورہ نساء کی آیت کا منطوق عدم قبولیت کے لیے ظاہر ونص ہے، خالداً فیھا وغضب الله علیه ولعنة کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا اور منطوق مفہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو۔ کما تقرر فی الاصول۔

ثانیاً یہ کہنا کہ سورہ فرقان کی آیت نے اس کو منسوخ کردیا صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آیۂ فرقان مکی ہے اور آیۂ نساء مدنی۔ خود ترجمان القرآن اور خیر الامت یعنی ابن عباس شہادت دے رہے ہیں کہ نزلت فی آخر مانزل ومانسخها شی" اور معلوم ہے کہ ناسخ کے لیے تقدم زمانی ہونا ضروری ہے۔

ثالثاً دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے کہ متاخرین کا مصطلحہ نسخ مانا جاسکے۔ دونوں کا مورد الگ الگ ہے۔ پس اگر نسخ ہوسکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہوسکتا ہے جیسا کہ ابن عباسؓ نے کہا۔ یعنی عام وخاص کا نسخ۔ سورہ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ الایمان یھدم ماقبله ہے۔

یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کردیتا ہے اس لیے جب شرک سے توبہ ہوسکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہ ہو؟ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ "الا من تاب" کے بعد "وامن" کا لفظ بھی موجود ہے۔

یعنی توبہ کی اور ایمان لایا" جس سے واضح ہوگیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے، نہ کہ ایک مومن کی توبہ معصیت بعداز اسلام۔ سورہ فرقان کا آخری رکوع "وعباد الرحمٰن" سے پڑھو تو تمام آیات کا ٹھیک ٹھیک محل و مورد واضح ہو جائے گا۔ وہاں ذکر خدا کے نیک بندوں کے اسلامی و ایمانی اوصاف کا ہے۔ انہی میں ان اوصاف کو بھی داخل کیا ہے کہ "نہ شرک کرتے ہیں نہ کسی نفس کو قتل کرتے ہیں۔ نہ زنا کا ان سے ارتکاب ہوتا ہے" پھر بتلایا ہے کہ مسلمان جن برائیوں سے بچتے ہیں؟ یہ وہ برائیاں ہیں جن کا نتیجہ عذاب جہنم ہے اس کے بعد فرمایا "اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ" (۲۵:۷۰)

ہاں لیکن جو لوگ مسلمان ہو جائیں تو انہوں نے کفر کی حالت میں اس طرح کے جس قدر افعال کیے ہوں ان کا مواخذہ نہ ہوگا۔ اسلام ان کی برائیوں سے آلودہ زندگی کو نیکیوں اور خوبیوں سے بھر دیگا۔

پس اس آیت میں توبہ کفر کی قبولیت کا ویسا ہی ایک حکم ہے جیسا صدہا مقامات میں وارد ہے۔ اس کو مسلمان قاتل مسلم اور مرتکب حمل سلاح علی المسلم کے معاملہ سے کیا تعلق؟ اور اگر اس کا ذکر کسی دوسری آیت میں آیا ہے تو کیوں ناسخ و منسوخ ہونے کی ضرورت پیش آئے؟ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں۔

لیکن سورہ نساء میں قتل نفس کی ایک خاص حالت کا ذکر ہے یعنی اگر ایک مسلمان باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو قتل کر ڈالے تو اس کا کیا حکم؟ فرمایا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (۴:۹۳) چنانچہ اس آیت سے پہلے ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاءً (۴:۹۲) الخ پس زیادہ سے زیادہ دونوں آیتوں میں عام و خاص کا تعلق ہے یعنی اس آیت نے آیت فرقان کی تخصیص کر دی اسی لیے حضرت ابن عباسؓ نے کہا۔ " نسختها اية مدنية فى النساء" کیونکہ سلف کی اصطلاح میں "نسخ" کا اطلاق ہر طرح کی تخصیص و تقلید پر ہوتا تھا وہ معنی نہ تھے جو بعد کو اصولیوں نے قرار دیے اور اسی اختلاف حالت و حکم کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے کہا۔ فهذه لاولئک" یعنی آیت فرقان میں حکم کفار کے لیے ہے اور امام بخاری کی روایت ابن جبیر بطریق شعبہ مندرجہ کتاب التفسیر میں کہا "كانت هذه فى الجاهلية" یہ حکم مشرکین جاہلیت کے لیے تھا نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

اور یہ جو انہوں نے کہا کہ "وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ (۲۵:۶۸) الخ کے نزول پر مشرکین مایوس ہو گئے تھے۔ اس لیے الا من تاب اتری، تو اس کی تائید مفسرین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ "نزلت فى قوم يئسوا من التوبه" یعنی ان لوگوں کے حق میں اتری جو زمانہ کفر کی بدعملیوں کی بخشش سے مایوس ہو گئے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ

آیت اور سورہ نساء کی اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴: ۴۸)
اور سورہ زمر کی آیہ رحمت: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۳۹: ۵۳) الخ وحشی قاتل حمزہ کے بارے میں اتریں۔ وہ کہتا تھا کہ شرک میں ساری عمر کٹی، پیغمبر کے چچا کو قتل کیا۔ فواحش میں ہمیشہ مبتلا رہا۔ انہی تین برائیوں سے اجتناب کا خاص طور پر آیت فرقان میں ذکر ہے اب اگر میں مسلمان بھی ہو گیا تو کیا فائدہ؟ مجھے تو نجات مل ہی نہیں سکتی۔ اس پر "الا من تاب" اتری اور پھر مزید بشارت امید کے لیے سورہ نساء اور سورہ زمر کی آیات نازل ہوئیں۔ تعجب ہے کہ بعض شارحین کو مذہب ابن عباسؓ کی شرح و تطبیق میں مشکلات کیوں پیش آئیں؟ ان کا بیان تو بالکل صاف اور واضح ہے۔

رابعاً احادیث سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً امام احمد و نسائی کی روایت معاویہ بطریق ادریس خولانی مرفوعاً "کل ذنب عسی اللہ ان یغفرہ الا الرجل یموت کافراً او لرجل یقتل مومنا متعمداً" یعنی تمام گناہ اللہ بخش دے سکتا ہے لیکن وہ شخص جو حالت کفر میں مرے یا وہ جس نے جان بوجھ کر مومن کو قتل کر ڈالا۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں وسعت رحمت و عموم عفو و بخشش، و عدم جواز یاس و قنوط وغیرہ کا ذکر ہے، تو اس مذہب کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی مثل تمام عمومات قرآن کے ہیں، جن کی تخصیص آیہ نساء اور اس کی مویدات فی السنت نے کر دی۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ قبل از اسلام معاصی کی بخشش تو مسلم ہی ہے۔ بحث بعد از اسلام ارتکاب قتل میں ہے۔ اسی طرح اگر حدیث اسرائیلی "الذی قتل تسعۃ وتسعین نفسالم الی تمام المائۃ ثم تاب" پیش کی جائے تو جواب یہ ہوگا کہ اس کا محل بھی تو بیاسلام ہے نہ کہ توبہ مسلم اور وہ بھی مثل عمومات بشارات رحمت و بخشش کے ہے۔ خصصات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرضیکہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن عام طور پر علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا۔ یعنی قبولیت توبہ کو اور خوارج و معتزلہ کے غلو کی وجہ سے اہل سنت کا رجحان اسی کی طرف بڑھتا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے لیکن توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے۔ اس میں شک نہیں کہ احتیاط حکم امید ہی میں ہے، نہ کہ پیام یاس و قنوط میں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴: ۴۸) کے حکم کا عموم بڑا ہی امید افزا ہے اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو کچھ شک نہیں کہ دوسرا مذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔

(۲) قتل مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم و متاسف نہ ہو

مثلاً کوئی مسلمان فوجی ہو وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہی ہے مسلمان سامنے ہوں گے تو انہی سے لڑیں گے۔ یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں، یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا یہی حکم ہے ہم نے ان کا نمک کھایا ہے، اس لیے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کردو تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً وحتماً کافر ہے یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار ومشرکین کا ہے، دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ یہ حکم خاص اس مسئلہ ہی پر موقوف نہیں ہے ہر محلل حرام غیر ماوّل کے لیے یہی حکم ہے۔

(۳) تیسری صورت قتل مسلم کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لیے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے یہ صورت اس جرم کے کفر وعدوان کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت ہے جس سے زیادہ کفر وکافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے وہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں جو ایک مسلمان اس دنیا میں کرسکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آسکتا ہے، سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔ جو مسلمان ایسے فعل کا مرتکب ہو وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔ اس کی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنانِ حق کی اعانت ونصرت کی ہے اور یہ بالاتفاق وبالاجماع کفر صریح وقطعی مخرج عن الملۃ ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقۂ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان واسلام باقی رہ سکتا ہے؟

واقعہ امام حسین علیہ السلام

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لینا چاہیے گو نا اہل ہو، تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید بن معاویہؓ کی حکومت کے خلاف کیوں خروج کیا؟ اور کیوں ان کو برسرِ حق اور شہید ظلم و جور تسلیم کیا جاتا ہے؟

پس گو بحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں مخل ہوگا لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس لیے صاف کر دینا ضروری ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسینؓ اس حالت میں لڑے، جبکہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے واقعہ کربلا کا وسعتِ نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں۔ حضرت امام جب مدینہ سے چلے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ جب کربلا میں حق پرستانہ لڑ کر شہید ہوئے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ دونوں حالتیں مختلف ہیں اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف ہے۔

جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی، نہ اہم مقامات و مراکز نے اس کو خلیفہ تسلیم کیا تھا، نہ اہل حل وعقد کا اس پر اجماع ہوا تھا۔ ابتداء سے معاملہ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے پھر حضرت علیؓ کے زمانہ میں مدینہ کی جگہ کوفہ دار الخلافہ بنا۔ اہل مدینہ اس وقت تک متفق نہیں ہوئے تھے۔ کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی یک قلم مخالف تھی اور حضرت امام حسینؓ سے بیعت کرنے کے لیے پیہم اصرار و الحاح کر رہی تھی۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہو چکا تھا اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، ایک بہت بڑی مرکزی و موثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب و سوال کو منظور کر لیا۔ البتہ اس منظوری میں مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نا اہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے۔

اگر کہا جائے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شے نہیں ہے۔ اصلی شرط خلافت کی انعقاد حکومت ہے۔ یزید کو گو ولی عہد مقرر کر دیا ہو، لیکن جب تک اس کی خلافت بالفعل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب یزید کو ولی عہدی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیعت طلب کی گئی تو انہوں نے صاف

انکار کر دیا اور کہا "لا ابایع لامیرین" میں دو امیروں سے بیک وقت بیعت نہ کروں گا۔ یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں ولی عہدی کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے، جس کی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ (رواہ ابن حبان ونقلہ فی الفتح)

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے تو یکا یک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کر چکے ہیں اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیرؑ کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملۂ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا۔ وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرالیں۔ مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرا دیں یا مردانہ وار لڑ کر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرا دے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی اور خود فروشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدان کارزار گرم ہوا ہے اس وقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے، نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے ان کی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جس کو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے آپ کو زندہ گرفتار کرا دینا پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ طاقتور ظلم کے مقابلے میں بے سروسامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے جس کو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

شرط قرشیت

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انتخاب خلیفہ وامام کے لیے متعدد شرطیں ہیں۔ ازانجملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندان قریش میں سے ہونا چاہیے۔لیکن اگر امت کے لیے انتخاب کا موقعہ باقی نہ رہا ہوتو خلیفہ تسلیم کر لینے کے لیے بجز اسلام اور انعقاد حکومت (یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے) کے اور کوئی شرط نہیں ہے۔خلفائے راشدینؓ کے بعد جامع الشروط سلسلہ خلافت کوئی بھی قائم نہ ہوا۔ بنوامیہ وعباسیہ میں اگر ایک شرط قرشیت کی پائی جاتی تھی تو اور بہت سی اہم شرطیں مفقود تھیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب واجماع سے ہو۔سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی۔ پھر خلیفہ کو عادل ومنصف ہونا چاہیے۔حکومت نظام شوریٰ کے ساتھ کرنی چاہیے،سنت رسول اور سنت خلفاء راشدینؓ پر عامل ہونا چاہیے۔بجز عمر بن عبدالعزیزؒ کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا۔عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی۔ پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا۔آخری مصری خلیفہؒ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خلافت بلانزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کے لیے شرع وامت کا مرکزی اقتدا ہے اگر بنوامیہ وعباسیہ میں پانچ شرطیں نہیں پائی جاتی تھیں تو ان میں سات نہ سہی۔یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم ونافذ خلافت کے ماننے کا ہے اس لیے شرائط کی بحث کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

منجملہ شروط خلافت کے ایک متفق علیہ شرط حریت کی ہے۔یعنی خلیفہ آزاد ہو غلام نہ ہو۔ مصلحت وضرورت بھی اس کی ظاہر ہے۔مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرسکتی ہے کہ غلاموں نے امامت کی ہے پادشاہت کی ہے اور تمام سادات وقریش اور شرفا،عرب وعجم نے ان کے آگے اطاعت کا سر جھکایا۔خود حدیث میں وارد ہے ''اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبدحبشی کان راسه زبیبة'' اور روایت ابوذر عند مسلم کہ ''وان کان عبدامجدع الاطراف'' اور روایت ابن حصین کہ ''ولو استعمل علیکم عبدیقودکم بکتاب الله، اسمعوا له واطیعوا یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہوجائے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔حافظ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔'' والمراد اخس العبید، ای اسمع واطیع

وان کان دنّی النسب حتی لوکان عبداسود مقطوع الاطراف، فطاعته واجبة، ویتصور امارة العبد اذا ولاہ بعض الائمة اویغلب علی البلاد بشوکة والباعه، ولایجوزابتداء عقد الولایه له مع الاختیار، بل شرطها الحریة" (جلد ۲. ۱۲۵) یعنی یہ جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو تو مقصود اس کا یہ ہے کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب وخاندان کا ہو، لیکن اگر خلیفہ ہو گیا ہے تو اطاعت کرو اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے اگر کسی امام نے مقرر کر دیا ہو یا خود وہ شہروں پر غالب آ کر مسلط ہو۔ البتہ جائز نہیں کہ ابتدا میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جائے کیونکہ آزاد ہونا شرائط امامت میں سے ہے اور فتح الباری میں ہے "لو تغلب حقیقته بطریق الشوکة فان طاعته تجب اخماداً للفتنة (۱۳: ۱۰۹)

جب غلبہ وتسلط کی صورت میں خود حافظ نووی (جو شرط قرشیت کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ہیں) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دنی النسب خسیس الحال حبشی غلام امیر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے۔ ... تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب ومسلط خلیفہ کی خلافت کے لیے شرط قرشیت کا موجود نہ ہونا کیوں مخل ہو۔ اگرچہ قرشیت ایک شرط ابتدائی مان لی جائے؟

پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے ترکان عثمانی کی خلافت مسلمہ ومنعقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یک قلم غیر متعلق ہے۔ تاہم تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہو گا کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر ڈالی جائے۔

الائمة من قریش

تحقیق امارت قریش و شرط قرشیت

جہاں تک قرآن وسنت آثار صحابہ اور تمام دلائل شرعیہ وعقلیہ کا تعلق ہے، کوئی نص قطعی موجود نہیں، جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملہ خلافت وامامت صرف خاندان قریش کے لیے شرعاً مخصوص کردیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں، سب صحیح ہیں یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجمع صحابہ میں اس کو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی اور یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا، لوگ اس کو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے۔ بایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے، نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کی تمام قومی ونسلی امتیازات مٹانے اور ہمیشہ کے لیے صرف انسانیت کی بے قید وعام عظمت کو قائم کردینے اور "دعمل" کے قانون الٰہی کے آخری اعلان کے لیے آیا تھا اس کے نام سے ساری باتیں مان لی جاسکتی ہیں لیکن اس کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے خاندان ونسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز نسب کے جس بت کو خود اس نے توڑا ہو، انہی ٹکڑوں کو پھر جوڑ کر از سر نو ایک نیابت خانہ قائم کر جائے؟

تفصیل ودلائل کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ہر اس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، روشن ہے کہ ہر طرح کے نسلی وخاندانی امتیازات کے مٹانے میں اسلامی احکام واعمال کا یہ حال رہا ہے؟ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جہاں کے غرور قوم ونسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک چرواہا اپنے نسبی وخاندانی شرف کے سامنے قیصر وکسریٰ کو بھی ذلیل وحقیر سمجھتا تھا۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی ووطنی امتیازات کی پرستش کررہی تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل وقوم کے بت پر لگائی اور اللہ کے اس قانون فطرت کی عام منادی بلند کی: "يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" (۴۹.۱۳) یعنی بنیاد ہر طرح کی بزرگی وفضیلت کی صرف عمل ہے، اور کوئی شے نہیں، قوموں اور

خاندانوں کی تفریق صرف اس لیے ہے کہ باہمدگر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلائے۔ سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو اور فرمایا۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی • وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی • وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی (۵۳:۳۸،۴۰)

ہر انسان اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے اور انسان کی تمام کامیابیوں اور سعادتوں کی بنیاد صرف اس کی کوشش اور اس کا عمل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر قول وفعل یہ رہا کہ "لیس منا من دعی الی عصبیة" اور "لیس منا من قاتل علی عصبیة" اور لیس منا من مات علی عصبیة" یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل وقوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جائے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو تعصب کی بنا پر لوگوں سے جنگ کرے۔ دنیا کو چھوڑنے سے پہلے حجۃ الوداع میں جو آخری پیام امت کو آپؐ نے دیا، اس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی یعنی نوع انسانی کی عام مساوات کا اعلان: "لافضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی کلکم ابناء آدم". (شیخان) اور فرمایا "لیس لاحد فضل علی احد الابدین وتقوی. الناس کلهم بنو آدم، وادم من تراب" (رواہ الجماعة)

یعنی اسلام کا ظہور وقیام نوع انسانی کی مساوات اور باہمدگر برابری کا اعلان ہے۔ اب نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربؐ پر ملک وقوم کی وجہ سے فضیلت مل سکتی ہے۔ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور وہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہو۔

معمورۂ دلے اگرت ہست، باز گوئے
کین جا سخن بہ ملک فریدوں نمی رود

عملاً یہ حال تھا کہ آپؐ نے اپنی زندگی میں سب سے آخری فوجی مہم جو بھیجی اس کی سرداری اسامہؓ کو دی جن کے والد زیدؓ آپؐ کے غلام تھے۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا۔ "لقد طعنتم فی امارة ابیه وقد کان لها اهلا، وان اسامة لها اهل" "تم لوگ پہلے زیدؓ کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا اور اب اسامہؓ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے" "اہل" کے لفظ پر زور دیا یعنی طعن بیکار ہے کیونکہ بنیاد معاملۂ امارت وسرداری کی صرف اہلیت وقابلیت ہے اور کچھ نہیں۔ حضرت عائشہؓ کا قول مشہور ہے۔ "لو کان زید حیا ماستخلف رسول الله غیره" اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید زندہ رہتے تو آپ ان کے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے۔ اسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی تھی جانتے ہو اس میں کیسے کیسے لوگ شریک تھے؟ بڑے بڑے

مہاجرین و قریش اور سادات عرب جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام نظر آتا ہے، وہی ابوبکرؓ جو چند دنوں کے بعد رسول اللہ کے جانشین اور تمام امت کے امیر ہونے والے ہیں!

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسیؓ کا جو حال تھا، معلوم ہے بلالؓ کو عمر فاروقؓ جیسے قرشی نے "ہمارا آقا و سردار" کہا اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے "**نعم العبد صہیب لو لم یخف اللہ لم یعصہ**" صہیب اللہ کا کیا نیک بندہ ہے! اگر خوف عذاب نہ ہوتا جب بھی اس کی فطرت بدی پر مائل نہ ہوتی۔ مرنے کے وقت وصیت کی کہ نماز جنازہ وہی پڑھائیں۔ سلمان کا یہ حال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے "**سلمان منا اھل البیت**" سلمان تو ہم اہل بیت نبوت میں سے ہے۔ اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسلی عصبیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور وہ زمانہ آ گیا جب بزرگی و فضیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب ان کے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھک گئے تھے جس طرح ایک قرشی و ہاشمی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو امام زہری سے کہنا پڑا۔ "**واللہ لیسودن الموالی العرب ویخطب لھم علی المنابر، والعرب تحتھم**۔" (عقد الفرید)

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کے لیے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا داعی تمام دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور مساوات عامہ کی طرف بلا رہا ہو۔ لیکن (نعوذ باللہ) خود اس درجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کے لیے بادشاہی و خلافت صرف اپنے ہی خاندان کے لیے مخصوص کر دے؟ وہ تمام نوع انسانی سے تو کہے کہ تمہارے سارے بنائے ہوئے حق جھوٹے ہیں۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت بلکہ صرف ملک صرف قوم، صرف نسل اور صرف خاندان؟

کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟

خیر یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی لیکن ہم بلا تامل باور کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت سے ٹھیک ٹھیک ثابت ہوتی۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے بطریق صحیح ثابت ہو۔ کچھ ضروری نہیں کہ ہماری نارسا سمجھ اس کا احاطہ و ادراک بھی کر سکے۔ لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلی و قیاسی استبعاد نہیں ہے۔ یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں اور چونکہ ثابت نہیں، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ اسلام کے لیے کوئی ایسی بات ثابت بھی نہیں ہوئی

چاہیے۔

شارع کے بیانات، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے واقع ہوئے ہیں۔ از انجملہ ایک صورت احکام واوامر اور تشریع کی ہے۔ یعنی بحیثیت شرع ودین کے کوئی حکم دینا اور قانون ٹھہرا دینا۔ دوسری صورت اخبار واطلاعات کی ہے۔ یہ دوسری صورت مجرد بیان واقعہ وحال ہے اور اگر آئندہ کی نسبت سے ہے تو پیشین گوئی ہے۔ حکم اور تشریع نہیں ہے۔ یعنی صرف ایک خبر ہے کہ ایسا ہوگا یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے۔

قریش کی خلافت کی نسبت جس قدر روایات موجود ہیں، سب دوسری قسم میں داخل ہیں نہ کہ پہلی قسم میں۔ اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔

(ا) یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ، ابو برزہؓ، کثیر بن مرہؓ، جابر بن عبداللہؓ، جابر بن سمرہؓ، معاویہ بن صفیانؓ، وغیرہم مختلف صحابہ سے مروی ہے اور عمدہ طریق وہ ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں۔ لیکن کسی طریق و روایت میں بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا۔ تشریع وامر تھا۔

"**عن ابی هریرة الناس تبع لقریش فی هذالشان مسلمهم ولمسلمهم وکافرهم ولکافرهم**" (مسلم) دوسرے طریق میں زیادہ وضاحت ہے۔ **مسلمهم تبع لسملهم، وکافرهم تبع لکافرهم**" (مسلم) جابر کی روایت میں "**الناس تبع لقریش فی الخیر والشرہ**" ہے۔ امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "**معناہ فی الاسلام و الجاهلیة لانهم کانوا فی الجاهلیة روساء العرب واصحاب حرم الله واهل الحج، وکانت العرب تنتظر اسلامهم، فلمااسلموا وفتحت مکه تبعهم الناس، وجاء ت وفود العرب من کل جهة ودخل الناس فی دین الله افواجا**(جلد ۲۔۱۱۹) پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کو مسئلہ خلافت کے اختصاص، شرائط سے کوئی تعلق نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی ہمسائیگی کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا اور ہر کام میں سب کی نظریں اسی پر اٹھتی تھیں۔ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اور قریش مسلمان نہ ہوئے، تمام عرب کے قدم رکے رہے۔ جونہی قریش مسلمان ہوئے، سب نے ان کی پیروی کی اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہوگیا۔ پس فرمایا "**الناس تبع لقریش**" لوگ جاہلیت اور اسلام، دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوئے۔ وہ بگڑے رہے تو سارا عرب بگڑا رہا، وہ سنورے تو سب سنور گئے اور یہ بالکل حق و معلوم ہے۔

ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر ملک وقوم پر ہوتا ہے۔ اچھی بری ہر طرح کی باتوں میں لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی روایت سے یہی حدیث مسند امام احمد میں یوں مروی ہے۔ "برالناس تبع لبرهم وفاجرهم تبع لفاجرهم" اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے روایت کیا۔" كان هذالامر فى حمير فنزعه الله منهم رجعله فى قريش "لیکن اس سے یہ بات کیونکر ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کا خلیفہ بجز ان کے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا؟ اسلام صرف عرب ہی کا اسلام نہ تھا جس کے سردار قریش تھے اسلام تمام عالم کے لیے اسلام ہے جس کی ریاست و سرداری صرف علم وعمل حق ہی کو مل سکتی ہے اور یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے!

(۲) امام بخاری نے جابر بن سمرہ سے ایک اور حدیث روایت کی ہے "سمعت النبى صلى الله عليه وسلم يقول ان يكون اثنا عشر اميراً. فقال كلمة لم اسمعها فقال ابى انه قال كلهم من قريش" یہ حدیث مختلف طریقوں اور لفظوں سے تمام اصحاب سنن ومسانید نے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں صفیان بن عیینہ کے طریق "لايزال امر الناس ماضيا ماوليهم اثناء عشر اجلا. لم تكلم النبى بكلمة حفيت على. فسئلت ابى ماذا قال؟ فقال كلهم مين قريش" اور حصین بن عمران کے طریق سے "ان هذالامر لاينقضى حتى يمضى فيهم اثنا عشرة خليفة" اور سماک بن حرب سے "لايزال الاسلام عزيزا منيعا الى اثنى عشر خليفة" مروی ہے۔ شعبی کے طریق عندابی داؤد میں ہے "فكبر الناس وضحوا" اور اسماعیل بن ابی خالد عن ابیہ سے اسی میں ہے "لايزال هذالدين قائما حتى يكون عليكم اثنا عشر خليفة كلهم تجتمع الامة عليه "طبرانی نے اسود بن سعید کے طریق سے اس پر زیادت کی "لاتضرهم عداوة من عاداهم" بعض طریق میں ہے "لايزال هذالامر صالحا" او ماضياً (رواهما احمد) اور بزار وطبرانی نے ابوجحیفہ سے روایت کیا ہے "لايزال امرامتى قائماً حتى يمضى اثنا عشر خليفة كلهم من قريش." یہی روایت ابوداؤد میں اس اضافہ کے ساتھ ہے۔ فلما رجع الى منزله اتته قريش فقالوا ثم يكون ماذا؟ فقال ثم يكون الهرج" حاصل تمام روایتوں کا یہ ہے کہ آپ آئندہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں سب قریش سے ہوں گے۔ کسی دشمن کی دشمنی ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ جب تک یہ بارہ خلیفہ حکمران رہیں گے اسلام باعزت رہے گا اور لوگ خوشحال۔

اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کردیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جارہا ہے، اس سے صرف آئندہ کی نسبت اطلاع دینا مقصود ہے حکم وتشریع نہیں ہے۔ ہم نے تمام روایات وطریق نقل کر دیئے ہیں۔

کسی روایت اور طریق سے بھی ایسا لفظ ثابت نہیں جس سے حکم و تشریع نکل سکے۔

(۳) ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جس کو امام بخاری نے "باب الامراء من قریش" کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھی جائے تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جائے گی۔ امیر معاویہؓ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبداللہ بن عمروؓ کہا کرتے ہیں۔ "سیکون ملك من قحطان" "قحطان میں سے ایک بادشاہ ہوگا۔ امیر معاویہؓ یہ سن کر غضبناک ہوئے اور خطبہ دیا بلغنی ان رجالاً منکم یحدثون احادیث لیست فی کتاب اللہ ولاتوثر عن رسول اللہ (الخ) مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں کہ نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسول سے ثابت ہیں۔" انی سمعت رسول اللہ یقول ان هذاالامر فی قریش، لایعدیهم احد الا کبه اللہ علی وجهه ماافاموا الدین" میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ یہ بات (یعنی حکومت) قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھیں گے، جو ان کی مخالفت کرے گا الٹا رسوا ہوگا یعنی کامیاب نہ ہوگا۔

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا۔ معلوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے یہ پیشین گوئی تھی اور حرف بحرف پوری ہوئی۔ یعنی آپ نے بتلا دیا تھا، کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت رہے گی۔ حکومت انہی کے قبضے میں رہے گی جو ان کے خلاف اٹھے گا ناکام رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہی اسلامی خلافت کے وہی مالک رہے جب اس کے اہل نہ رہے، عجم و ترک نے یہ بار اٹھا لیا۔ یہ حکم اِنْ یَّشَا یُذْهِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۰ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ (۱۶:۳۵۔۱۷) اور یَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَیْرَکُمْ (۴۷:۳۸) (الخ) باقی رہا امیر معاویہؓ کا ابن عمروؓ پر انکار، تو یہ بھی صحیح نہ تھا، وہ صرف یہ بات سن کر گھبرا اٹھے کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے، اصلیت پر غور نہیں کیا۔ قحطانی والی حدیث بطریق رفع ثابت ہے اور قریش والی حدیث میں ماافاموا الدین" کی قید موجود ہے۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اسی بنا پر ائمہ حدیث نے حدیث قحطانی اور حدیث قریش میں تطبیق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارت قریش والی روایت تشریع نہیں ہے محض خبر ہے اور وہ بھی "ماافاموا الدین " کے ساتھ مقید۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔" هذاانکار من معاویة بلا تامل، والا، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعاً، وماذکر فی المعارضة، فهو حجة لما فیه من التقیید بقوله! ماافاموا الدین" اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے۔" الذی انکره معاویة فی حدیث مایقوله یقرله ماافاموا الدین فربما کان فیهم من لایقیمه فیتسلط القحطانی علیه وهو کلامه مستقیم" (۱۳۔۱۰۲) یعنی امیر معاویہؓ کا انکار کر دینا ان کی

بے غوری کا نتیجہ تھا۔ ورنہ قحطانی والی بات ثابت ہے۔ امیر معاویہؓ نے جو حدیث معارضہ میں پیش کی، اس کا آخری ٹکڑا خود انہی پر حجت ہے اور ابن عمرو کی تصدیق کر رہا ہے یعنی اس میں "ما اقاموا الدین" کی قید موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہیں گے جو دین قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی غیر قریشی مسلط ہو جائے گا۔

(۴) صحیح بخاری کے ترجمہ باب سے واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے انہوں نے باب باندھا ہے۔ "الامراء من قریش "قریش میں امارت اور امراء اس مضمون کا باب نہیں باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش میں ہونی چاہیے۔

(۵) امام بخاری نے ایک دوسری روایت ابن عمرؓ کی درج کی ہے جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے:
"لایزال ھذا الامر فی قریش مابقی منھم"۔ یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہے گی جب تک دو آدمی ان میں باقی رہیں گے۔

اس روایت سے ہمارے بیان کی اور مزید تصدیق ہوگئی۔ حدیث کا منطوق صریح پیشین گوئی کا ہے اگر اس کا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ دو کی جگہ ہزاروں قرشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی۔ پس ضرور ہے کہ "مابقی منھم اثنان" کے منطوق پر مفہوم کو ترجیح دی جائے اور وہ یہی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہیں گے جو خلافت کے اہل ہوں گے تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا۔ مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آجائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں تو مشیت الٰہی اپنے قانون انتخاب اصلح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرمادے گی اور قریش خلافت سے محروم ہو جائیں گے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا یعنی معتصم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کے لیے رہ گیا تھا۔ تاہم اقتدار خلافت انہی کا رہا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دعوےٰ کر سکے کیسی کیسی طاقتور اور باجبروت عجمی و سلجوقی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن سب اپنا بڑے سے بڑا شرف یہی سمجھتے رہے کہ مقام خلافت سے انہیں خدمت و برآری و کارگزاری خلافت کا کوئی لقب مل جائے اور بس اگر ایک قرشی، فاطمی، عباسی، تن تنہا کسی ہنگامہ و قتال سے بچ کر نکل جاتا تو جس گوشہ عالم میں پہنچ جاتا، ایک عالم اس کے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا۔ گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی۔ ایک اموی شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہو کر یورپ جا پہنچا۔ وہاں پانچ صدیوں تک کے لیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہوگئی۔ لیکن جب عرب و قریش کے

تنزل اور ادبار کا وہ آخری وقت آ گیا کہ وہ قریشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے، تو تاریخ خلافت نے ما صفحہ الٹ دیا، اور یک قلم غیر عربی و غیر قریشی خلافت کا دور شروع ہو گیا۔ وکان وعداً مفعولاً۔

(۶) اشتباہ و اضطراب کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں جب ترمذی کی وہ روایت سامنے آ جاتی ہے جس میں امارت قریش کے ساتھ دو اور باتوں کا بھی ذکر ایک ہی سلسلے اور ایک ہی اسلوب میں کیا گیا ہے اور گویا روایت امارت کے متن کا وہ ایک متمم و مکمل ٹکڑا ہے جو بقیہ طرق میں رہ گیا تھا اس طریق میں مل جاتا ہے تاکہ اس کو جوڑ کر مضمون حدیث کامل کر لیا جائے۔ قریش والی حدیث اگرچہ مختلف راویوں سے مروی ہے لیکن سب سے زیادہ اور مشہور طرق ابو ہریرہ، جابر بن سمرہ، اور ابن عمر پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور امام مسلم، احمد، ابوداؤد طیالسی بزار، طبرانی کے تمام طریق تو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نکلے ہیں۔ انہی ابو ہریرہ سے بطریق ابو مریم انصاری ترمذی نے روایت کیا ہے۔" الملک فی قریش والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشة" (اسنادہ صحیح اور امام احمد کثیر بن مرہ سے یوں روایت کرتے ہیں۔"الخلافة فی قریش والحکم فی الانصار والدعوة فی الحبشه" (رجاله موثقون وایضاً رواه الطبرانی والبزار من وجه اخر)

اس روایت میں ایک ساتھ تین باتوں کا ذکر ہے۔ خلافت قریش میں قضاء و حکم انصار میں اور اذان و دعوۃ اہل حبش میں۔ پس جو معنی ایک بات کے ہوں گے وہی بقیہ دو کے ہوں گے اور جو مطلب دو باتوں کا ہوگا وہی پہلی بات کا بھی ہوگا۔ اگر پہلی بات (یعنی قریش کی حکومت) بیان حال اور پیشین گوئی نہیں ہے امر و تشریع ہے تو بقیہ دو جملوں کو بھی امر و تشریع قرار دینا پڑے گا یعنی ماننا پڑے گا کہ قاضی ہمیشہ انصاری ہی ہونا چاہیے اور موذن بجز حبشی کے دوسرا ہو نہیں سکتا لیکن معلوم ہے کہ آج تک نہ کسی نے ایسا کہا، نہ یہ مطلب سمجھا، نہ قضاء و اذان کے لیے کوئی شرعی اشتراط ملک و نسل کا تسلیم کیا گیا ہے۔

پس جو مطلب ان دو باتوں کا ہے وہی خلافت قریش کا بھی ہے۔ یا تو یہ بیان حال ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسا ہوا آپ خود قریشی تھے اور مسلمانوں کے امیر و رئیس کل قضاء پر اکثر انصار مامور ہوئے اور اذان حضرت بلال دیتے تھے۔ پس "الملک فی قریش، والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشه" کی تقسیم ہو گئی تھی یا آئندہ کی نسبت خبر ہے کہ حکومت قریشیوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ قضاء پر انصاری مامور ہوں گے اور اکثر ایسا ہوگا کہ موذن حبشی ہوں، کوئی خاص آنے والا عہد پیش نظر ہوگا۔ اسی کی نسبت یہ خبر آپ کی زبان مبارک پر طاری ہو گئی۔

(۷) اس حدیث کے جو متون و اسناد صحیحین نے اختیار کیے ہیں۔ ان کے بعد سب سے زیادہ

مشہور روایت وہ ہے جس کو ابوداؤد طیالسی، امام احمد ابویعلیٰ، طبرانیؒ وغیرہم نے حضرت ابوبرزہ اور انس سے روایت کیا ہے۔ "الائمة من قريش ماحكموا فعدلوا ووعدوا، فوفوا، واسترحموا" اور طبرانی نے حضرت علی سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ "الا ان الامراء من قريش مااقاموا ثلاثا" (الخ) اسی متن کو امام بخاری نے تاریخ میں اور طیالسی و بزار نے مسند میں حضرت انس سے یوں بھی روایت کیا ہے "الائمة من قريش ما اذا حكموا فعدلوا"، نسائی و حاکم نے بھی ایک دوسرے طریق سے یہ روایت لی ہے حاصل ان سب کا یہ ہے کہ فرمایا امراء اور ائمہ قریش میں سے ہیں جب تک ان میں عدل گستری، ایفاء عہد اور رحم و شفقت کے اوصاف باقی رہیں گے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ قریش کی خلافت اہلیت و صلاحیت کے ساتھ مشروط تھی یعنی پہلے ہی سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک صفات حسنہ ان میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہ بات نہ تھی کہ تشریعاً ہر حال میں خلافت کو انہی کا حق بتلایا ہو۔

(۸) اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض روایات میں قریش کی نسبت بصورت ظلم و جور عدم اتباع شریعت، سخت کلمات وعید بھی آئے ہیں۔ حتیٰ کہ کلمہ "لعن" بھی آیا ہے یہ بھی صاف صاف موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنت عادلہ کے مطابق ایسے لوگوں کو ان پر مسلط کر دے گا جن کا تسلط انکے لیے سخت اذیت و عقوبت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ طبرانی کی سابق الذکر روایت "مااقاموا ثلاثا" (الخ) میں یہ بھی ہے "فمن لم يفعل ذلك فعليه لعنة الله" یعنی تین وصف عدالت، ایفاء عہد اور رحم و شفقت کا بیان کر کے فرمایا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس پر اللہ کی پھٹکار اور احمد و ابویعلیٰ نے حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت کیا "يامعشر قريش! انكم اهل هذاالامر مالم تحدثوا، فاذا غيرتم، بعث الله عليكم من يلحاكم كمايلحى القضيب" (رجاله ثقات الا انه من رواية عبيدالله بن عبدالله بن عتبه بن مسعود، عن عم ابيه عبدالله ابن مسعود، ولم يدركه وايضاً اخرجه احمد عن ابى مسعود الانصارى من طريق عبيدالله وفى سماعه نظر، وله شاهد من مرسل عطاء بن يسار. اخرجه الشافعى والبيهقى بسند صحيح) یعنی اے جماعت قریش! جب تک تم کوئی نئی روش اختیار نہ کرو تم ہی اس بات کے اہل ہو لیکن اگر تم نے اپنی حالت بدل دی تو یاد رکھو اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم کو چھڑی کی طرح موڑ دیں گے۔

پس ان روایات سے دونوں باتوں کی مزید تصدیق ہو گئی۔ اول یہ کہ خلافت قریش کے تمام بیانات محض خبر ہیں۔ تشریع و امر نہیں۔ ثانیاً پہلے سے خبر دے دی گئی ہے کہ ہمیشہ خلافت انہی میں نہیں رہے گی۔ چنانچہ حرف بحرف یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور قریش پر یکے بعد دیگرے ایسے لوگ مسلط ہوئے

جنہوں نے ان کا سارا زور توڑ دیا حتی کہ حکومت قریش کا دنیا میں نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لایخبر عن شئی الا و جاء مثل فلق الصبح!

(۹) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے خلافت کو قریش میں مخصوص ثابت کرنا چاہا ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ان تمام روایات کا منطوق خبر کا ہے نہ کہ امر کا اور کوئی حدیث ایسی قوی ظاہر الدلالت موجود نہیں جس سے ان کا مدعا ثابت ہو سکے۔ وہ مجبور ہوئے ہیں کہ انہی احادیث کو تاویل و توجیہ کر کے اس امر پر محمول کریں۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی کی نسبت لکھا ہے۔"کانه جنح الی اله خبر بمعنی الامر"(۱۳:۱۰۵) اور ابن منیر نے کہا والحدیث وان کا ن بلفظ الخبر فھو بمعنی الامر کانه قال ائتموا بقریش خاصة"(ایضاً)

پس اس پر سب متفق ہیں کہ الفاظ حدیث میں صورت خبر کی ہے امر کی نہیں اور جب دلیل قوی وظاہر موجود نہیں۔ نہ قرآن میں، نہ سنت میں، نہ اقوال صحابہ میں تو پھر کیا مجبوری پیش آئی ہے کہ تاویلات اختیار کی جائیں اور نص کو بلاوجہ ظاہر و منطوق سے مصروف کیا جائے۔

(۱۰) اس حدیث کی تمام روایات وطرق پر ہم نے نظر ڈال لی۔ اب صرف دو روایتیں اور رہ گئیں جو مناقب قریش میں آئی ہیں اور جن سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے۔ بیہقی اور طبرانی نے جبیر بن مطعم اور ابن سائب سے روایت کیا۔ "قدموا قریشا ولاتعدوھا" یعنی قریش کو مقدم رکھو یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ قریش کو ہر بات میں آگے رکھو۔ خود پیچھے رہو۔

لیکن قطع نظر قوت وضعف روایت کے، اس سے بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ قریش کے سوا دوسرے کی خلافت جائز نہیں۔ قریش کو عرب میں ہر طرح تقدیم وریاست حاصل تھی۔ لوگ ان کی ریاست سے متاثر تھے پس فرمایا کہ اس بات کا لحاظ رکھا کرو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ امامت وخلافت کے حقدار ہمیشہ قریش ہی رہیں!

دوسری روایت امام احمد نے عمرو بن العاصؓ سے روایت کی ہے آنحضرت نے فرمایا "قریش قادة الناس" قریش لوگوں کے سردار ہیں۔ لیکن اس کو بھی اختصاص خلافت کے سوال سے کوئی تعلق نہیں یہ تو معلوم ہے کہ سردار قوم تھے لیکن اس کا حکم کہاں ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ صرف انہی میں سے ہو سکتا ہے! کیا ایک ایسے اہم مسئلہ کے لیے اس طرح کی باتیں یقین کا کام دے سکتی ہیں؟

(۱۱) باقی رہی حدیث "الائمة من قریش" اور یہ استدلال کہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں برخلاف انصار پیش کی اور سب نے تسلیم کر لیا تو اس سے بھی شرعاً اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اولاً تو یہ الفاظ اور حضرت ابوبکر والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں۔ فتح الباری میں ہے:

"الائمة من قریش (رجاله رجال الصحیح لکن فی سنده انقطاع)" (۱۰۱:۱۳)

ثانیاً اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑا ہے جو دوسری طریقوں سے صریح پیشین گوئی کے لفظوں میں پڑھ چکے ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات اس لیے پیش کی تھی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دے دی گئی ہے۔ پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے اس کے خلاف بات نہ اٹھاؤ۔ یہ سن کر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا۔

ثالثاً۔ "الناس تبع لقریش" والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں ان کی ریاست و سرداری سے تھا نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے۔ وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمادیا ہے جاہلیت اور اسلام، دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہیں گے اس لیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہے گا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو پوری طرح کھول دیتا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا" ان العرب لاتعرف هذاالامر لغیرهذاالحی" یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں۔ پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا۔ صرف ملکی و وقتی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیے۔ جس کی سرداری عرب کے تمام قبائل بلا چون و چرا تسلیم کر لیں!

رابعاً یہی روایت بعض دیگر طریق سے صاف صاف خبر کی صورت میں آئی ہے۔ امر و تشریع کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ ابن اسحاق نے کتاب الکبیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ کے مجمع میں فرمایا۔"ان هذا الامر فی قریش مااطاعوالله واستقاموا علی امره" (فتح ۱۳:۱۰۳) یعنی یہ بات قریش میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کریں گے اور اس میں مستقیم رہیں گے پس معلوم ہوا کہ امام احمد والی روایت میں راوی نے بقیہ ٹکڑا چھوڑ دیا ہے۔ صرف "الائمۃ من قریش" لے لیا ورنہ حضرت ابوبکرؓ نے وہی بات فرمائی تھی جو دیگر احادیث مرفوعہ میں بطور خبر کے ثابت ہو چکی ہے۔ علی الخصوص بخاری کی روایت معاویہؓ میں۔

حواشی

۱؎ اللہ اللہ، اس بارے میں اسلام و پیروان اسلام کے معاملات کیسے عجیب و غریب رہ چکے ہیں؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں، کیونکر یاد دلایا جائے کہ کسی زمانے میں اللہ اور اس کے رسول کے رشتہ کے سوا نہ کوئی رشتہ مقبول تھا، نہ عمل کی بزرگی کے سوا بزرگی تسلیم کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ انہی اسامہؓ کی نسبت نا قابل فراموش ہے ان کے لڑکے عبداللہؓ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال میں اسامہؓ بن زیدؓ سے مجھے کم درجہ پر کیوں رکھا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا۔ "کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابیک و کان احب الی رسولی اللہ منک. اس لیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اس کا باپ اللہ کے رسول کو پیارا تھا اور اس لیے کہ وہ خود بھی تجھ سے زیادہ رسول اللہ کے نزدیک محبوب تھا۔ یعنی بنائے استحقاق ہماری آپس کی رشتہ داریاں نہیں ہو سکتیں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک جو محبوب ہو وہی سب سے زیادہ حقدار ہے اور اسی کو ہر طرح کی برائی پہنچتی ہے۔ ایسے صدہا واقعات ان عہدوں میں گزر چکے ہیں۔ اسلام نے یہ انقلاب اس ملک میں پیدا کر دیا تھا جہاں کا بچہ بچہ غرور نسل و خاندان کے نشہ میں بدمست رہتا تھا۔ جو مغرور قریش کل تک قبائل یثرب کے شرفا کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں ان سے مقابل ہوں وہ اب غلاموں اور غلام زادوں کی سرداری بھی مان لینے کے لیے بلا چون و چرا تیار ہیں۔ سلطان اسلام کے لڑکے کے استحقاق پر ایک غلام زادہ کو ترجیح دی جارہی ہے وہ گردن جھکا دیتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے۔

دعویٰ اجماع

اب صرف ایک بات رہ گئی یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیت پر زور دینا اور قاضی عیاض وغیرہ کا دعوے اجماع، تو اس بارے میں چند امور قابل غور ونظر ہیں۔

اولاً اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے بلکہ اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ امام احمد نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔ اگر معاذ بن جبلؓ میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بناؤں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ معاذؓ قرشی نہ تھے انصار مدینہ سے تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت شرط ہوتی تو حضرت عمرؓ جیسا محرم اسرار خلافت کیونکر ان کی خلافت کا تصور بھی کرسکتا تھا؟ مسند امام احمد میں حضرت عمرؓ کا ایک اور قول بھی ابو رافع کی روایت سے موجود ہے۔ "لوادرکنی احد رجلین ثم جعلت هذاالامر الیه، اوثقت به. سالم مولی حذیفة وابوعبیده الجراح" اگر سالم مولی حذیفہؓ۔ اور ابوعبیدۃ الجراحؓ میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اس کے سپرد کر دیتا تو مجھے اس بارے میں پورا اطمینان واعتماد ہوتا۔ اگر حضرت عمرؓ صدہا صحابہ ومہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولی حذیفہ کو خلافت سپرد کر دینے کا ارادہ کر سکتے ہیں تو پھر کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں مل سکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا تھا!

چنانچہ اس بات کا خود ائمہ متاخرین کو اعتراف کرنا پڑا۔ حافظ ابن حجر قاضی عیاض کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔ "قلت ویحتاج من نقل الاجماع الی تاویل ماجاء عن عمر من ذالک. فقد اخرج امام احمد عن عمر بسند رجاله، ثقات ان ادرکنی اجلی (الخ)" الی ان قال "فیحمل ان یقال لعل الاجماع انعقد بعد عمر علی اشتراط ان یکون الخلیفة قرشیاً، او تغیرا جتهاد عمر فی ذلک والله اعلم (۱۰۶:۱۳) یعنی یہ جو قاضی عیاض نے کہا کہ خلافت کے مخصوص بہ قریش ہونے پر اجماع ہو چکا ہے تو اجماع ماننے کی صورت میں حضرت عمرؓ کے قول کی تاویل کرنی پڑے گی جو امام احمد نے بسند صحیح معاذ بن جبلؓ کے استخلاف کی نسبت روایت کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اس کی یوں تاویل کی جاسکتی ہے کہ شاید یہ اجماع حضرت عمرؓ کے بعد ہوا ہے یا یوں کہا جائے کہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد اس بارے میں بدل گیا۔

لیکن یہ تاویلیں جس قدر نا قابل التفات ہیں، اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اول تو جب اختصاص

قرشیت کے لیے کوئی نص شرعی موجود نہیں تو تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ثانیاً کہاں تو یہ دعوے کیا جاتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت سقیفہ کے مجمع ہی میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہوگیا اور تمام صحابہ نے اجماع کرلیا کہ خلافت کے حقدار صرف قریش ہی ہیں اور کہاں اب یہ تاویل کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا پورا زمانہ خلافت گزر گیا اور اجماع نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کی زمانہ خلافت کے دس برس گزر گئے اور صحابہ اس حکم سے بے خبر رہے لیکن اس کے بعد یکایک اس پر اجماع ہوگیا! پھر اگر اجماع ہوا تو کب؟ اور کونسی دلیل اس بارے میں موجود ہے؟

اگر سقیفہ بنی ساعدہ میں اجماع نہیں ہوا نہ خلافت صدیقی کے ڈھائی سال میں یہ مسئلہ چھڑا اور نہ عہد فاروقی کے بہترین دس سالوں میں صاف ہوا جو فقہ وعلم کی تنظیم وتحقیق کا اصلی عہد تھا تو پھر کیا یہ اجماع اس وقت منعقد ہوا جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ہنگامہ ہوا تھا یا اس وقت جب جمل وصفین کے میدان کارزار گرم ہوئے تھے!

اصل یہ ہے کہ واقعات کے تسلسل وتواتر سے خود بخود ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ لوگوں کو اجماع کا خیال پیدا ہوگیا۔ یعنی چونکہ ابتداء سے خلافت پر قریش ہی کا قبضہ ہوا اور یکے بعد دیگرے تمام سلاسل حکومت قرشی ہی ہوئے اس لیے لوگوں نے سمجھ لیا کہ شرعی فیصلہ بھی یہی ہے اور اس پر اجماع ہوگیا ہے ورنہ اجماع صحابہ کا کوئی ثبوت موجود نہیں اور نہ عرصہ تک کسی خاص خاندان میں حکومت کا رہ جانا دلیل تشریع وانعقاد اجماع ہوسکتا ہے۔ خود خلفاء عباسیہ کے عہد میں متعدد غیر قرشی مدعی اٹھے اور بعضوں کا ساتھ ہزاروں مسلمانوں نے دیا۔ وہ نہ خوارج میں سے تھے۔ نہ معتزلہ میں مگر یقین کرتے تھے کہ غیر قرشی خلیفہ ہوسکتا ہے۔ حجاج کے زمانہ میں ابن الاشعث نے خروج کیا اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ حالانکہ قرشی نہ تھا۔ اندلس اور افریقہ میں عبدالمومن صاحب ابن تومرت نے خلافت کے دعوے کے ساتھ حکومت قائم کی اور اس کی نسل میں عرصہ تک قائم رہی۔ ابن تومرت کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ معتزلی تھا؟ وہ امام غزالی کا شاگرد اور پکا اشعری تھا۔ عقائد اشاعرہ میں اس کا ایک رسالہ موجود ہے۔ مراکشی نے تاریخ مراکش میں تصریح کی ہے کہ بلاد مغرب میں اشعریت اسی کے ذریعہ پہنچی اور اسی لیے خاندان عبدالمومن کا سرکاری مذہب ہمیشہ اشعری رہا لیکن یہ لوگ بھی قرشی نہ تھے۔ علاوہ بریں خود ائمہ اشاعرہ میں سے بعض نے اس شرط سے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ امام ابوبکر باقلانی کی نسبت ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ جس اجماع کی نسبت دعوے کیا جارہا ہے اور جو کبھی حضرت ابوبکر کی بیعت سے پہلے مجلس سقیفہ میں رونما ہوتا ہے۔ کبھی وہاں سے روپوش ہوکر ساڑھے گیارہ برس تک مفقود ہوجاتا ہے اور حضرت عمرؓ غیر قرشی کے استخلاف کا ارادہ کرنے لگتے ہیں پھر ان کے بعد یکایک نمایاں ہونا چاہتا ہے لیکن

پھر بھی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ غیر قریشیوں کو ہزاروں مسلمان خلیفہ مان لیتے ہیں اور ائمہ عقائد و کلام مختلف فیہ نظر آتے ہیں۔ فی الحقیقت اس کا کوئی وجود ہے بھی نہیں؟

اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے۔

ثانیاً یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا وہ محض آئندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی۔ یعنی پیشین گوئی تھی اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک ان کا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے، ان کے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اجتہاد و قیاس کے لیے کسی چیز میں اتنی وسعت نہیں جس قدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیوں کا ایک خاص مبہم انداز بیان ہوتا ہے اور نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ مجمل اشارات کیے جاتے ہیں۔ جب تک ان کا ظہور نہ ہو جائے اشارات کی تفصیل اور اوصاف کے انطباق میں طرح طرح کی لغزشیں پیش آ جا سکتی ہیں۔

ظہور دجال کی پیشین گوئی اس معاملہ کے لیے ایک واضح مثال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے تمام غیر معمولی اوصاف بیان کر دیے تھے۔ باایں ہمہ خود صحابہ کرامؓ میں اختلاف ہوا اور اپنے عہد کے مختلف اشخاص کو بعض اوصاف کے اشتراک کی وجہ سے دجال سمجھتے رہے۔ آنحضرتؐ کے زمانے ہی میں ابن صیاد کی نسبت حضرت عمر کو خیال ہوا تھا حتیٰ کہ اس کو قتل کرنا چاہا جیسا کہ امام بخاری کی روایت ابن عمرؓ مندرجہ کتاب الجنائز میں موجود ہے اور ایک دوسری روایت مندرجہ کتاب الاعتصام بالسنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس پر اس درجہ یقین تھا کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ یعنی دجال ہے اور اسی لیے ابن جابر کو بھی اس پر پورا یقین تھا۔ "**رایت جابر بن عبداللہ یحلف باللہ ان ابن الصیاد الدجال** اسی طرح ابوداؤد کی روایت نافع میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نسبت مروی ہے کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ **واللہ ماشک ان المسیح الدجال هو ابن صیاد**" لیکن دیگر صحابہ کو اس سے اختلاف تھا۔ ابوسعید خدریؓ سے جب ابن صیاد کی صحبت ہوئی تو ان کا شک دور ہو گیا۔ حتیٰ کہ معذرت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے (کمافی المسلم) اور مسلم میں قصہ تمیم داری موجود ہے جس کی بنا پر لوگوں کو ابن صیاد کے دجال ہونے سے انکار تھا۔

پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی اس لیے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پوری طرح ظاہر نہ ہو جائیں، ان کا ٹھیک ٹھیک مطلب متعین کیا جا سکے۔ خلافت کا یہ حال رہا کہ گو ابتداء سے بہت مدعی اٹھے مگر فی الجملہ نویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی اور اسی بات کی احادیث میں بھی خبر دی گئی تھی، جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے، وہ سب وہی ہیں جن کا ظہور ساتویں صدی اور اس سے پیشتر یعنی

عہدِ خلافت قریش میں ہوا۔ پس ضرور تھا کہ معاملہ خلافت کو ابتداء سے قریش ہی میں محدود دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے۔ اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر لیتے کہ مقصود تشریع و حکم نہ تھا محض خبر دی گئی تھی۔ وہ ان حدیثوں کا مطلب صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے مجبور و معذور تھے۔

حافظ نواوی شرح مسلم میں لکھتے ہیں۔ "**وقد ظهر ماقاله صلعم فمن زمنه الی الآن الخلافة فی قریش من غیر مزاحمة لهم فیها، وتبقٰی کذلک مابقی منهم اثنان**" (جلد ۲۔۱۲۹) یعنی جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکاوٹ کے قریش ہی میں رہی اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہے گی۔ جب تک دو قرشی بھی دنیا میں باقی رہیں گے۔

حافظ نواوی کا سال وفات ۶۷۶ھ ہے اور سال پیدائش ۶۳۱ھ یا اس سے بھی پہلے۔ آخری خلیفہ بغداد المستعصم کو ہلاکو نے ۶۵۶ھ میں قتل کیا۔ پس گویا ان کی وفات فتنہ تاتار کے بعد ہوئی۔ لیکن تصنیف و تالیف کا زمانہ مستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے۔ اگر شرح مسلم وغیرہ بالکل آخری عمر کی تصنیف ثابت ہو جائے تو پھر خلفاء عباسیہ مصر کا زمانہ ہوگا کہ فی الجملہ قریش کی خلافت قائم تھی۔ پس وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور جمے ہوئے ہیں اور اسی لیے "**مابقی منهم اثنان**" کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے دو انسان بھی دنیا میں باقی رہیں گے، خلافت انہی میں رہے گی۔

لیکن اگر ان کو اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعوے کر سکتے تھے؟ کیا اس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ کیا وہ جانتے تھے کہ عنقریب صفحہ الٹنے والا ہے اور خلافت نہ صرف قریش سے بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے۔

اس سے بھی زیادہ بہتر مثال حافظ سیوطی کی ہے۔ حافظ موصوف عباسیہ مصر کے آخری عہد میں تاریخ الخلفاء اور حسن المحاضرہ لکھ رہے ہیں یعنی ہزارویں صدی کے اوائل میں۔ چونکہ اس وقت تک مصر میں عباسی خاندان منصب خلافت پر ممتاز تھا اور گو عالم اسلامی بہت سی نئی عجمی حکومتوں میں بٹ چکا تھا۔ تاہم لقب خلافت بجز عباسیہ مصر کے اور کسی کے قبضہ میں نہ تھا اس لیے انہوں نے تاریخ الخلفاء کے ابتداء میں ایک باب باندھا ہے۔ **احادیث المبشرة بخلافة بنی عباس**. اس میں وہ تمام روایتیں جمع کی ہیں جن میں عباسیہ کو خلافت پانے کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ تمہاری خلافت حضرت عیسیٰ کے نزول تک رہے گی۔ چنانچہ ابو نعیم کی روایت میں ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ پیدا ہوئے تو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "هو ابو الخلفاء حتی یکون منهم السفاح حتی یکون منهم المهدی، حتی یکون منهم من یصلی بعیسیٰ بن مریم" یعنی آپ نے فرمایا عبداللہ بن عباس خلفاء کا باپ ہے یہاں تک کہ انہی خلفاء میں سے سفاح ہوگا اور انہی میں سے مہدی ہوگا اور انہیں میں وہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ نماز پڑھے گا۔

اگر چہ یہ تمام روایتیں قطعاً جھوٹی ہیں۔ ابومسلم خراسانی وغیرہ عباسی داعیوں کی بنائی ہوئی ہیں، اور تمام ائمہ حدیث ونظر نے ان کے خرافات ووضعی ہونے پر اتفاق کیا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک عباسیوں میں خلافت کا انتساب باقی تھا اور واقعات کی بنا پر اس پیشین گوئی کی تکذیب نہیں ہوسکتی تھی۔ نیز عباسی خلافت کا حاکم نہ اثر ان روایات کی مقبولیت کا باعث ہو رہا تھا۔ اس لیے حافظ سیوطی ان کے لیے ایک خاص باب قائم کرتے ہیں اور اگر کسی روایت کو سنبھالنے کا ذرا سا بھی موقع مل جاتا ہے تو نہیں چوکتے۔ چنانچہ ابونعیم اور دیلمی کی روایات سے کچھ تعرض نہیں کیا ہے، حالانکہ حافظ مزی، ابن دقیق العید، ابن کثیر وغیرہم نے سخت انکار کیا ہے اور ابن جوزی کتاب الموضوعات میں لائے ہیں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیباچہ میں بنوعبید کی خلافت پر بحث کرتے ہوئے ان احادیث سے یقین کے لہجہ میں استدلال کرتے ہیں "ان الحدیث ورد بان هذا الامر اذا وصل الی بنی العباس لایخرج عنهم حتی یسلمون الی عیسیٰ بن مریم او المهدی" (تاریخ الخلفاء ۸۰) یعنی یہ بات حدیث میں آچکی ہے کہ جب خلافت آل عباس تک پہنچے گی تو پھر انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ حضرت عیسیٰ یا امام مہدی کے سپرد کر دیں گے۔

لیکن اگر حافظ سیوطی پچیس برس اور زندہ رہتے اور دیکھ لیتے کہ خلافت وحکومت کا نام ونشان تک عباسیہ میں باقی نہ رہا تو پھر ان کو پورا پورا یقین ہو جاتا کہ عباسیہ کو آخر عہد تک خلافت و پادشاہت کی کوئی بشارت نہیں دی گئی ہے اور یقیناً یہ تمام حدیثیں وضعی ہیں جیسا کہ ائمہ اثر فیصلہ کر چکے ہیں۔

چنانچہ یہ بات صاف صاف تتبع ونظر سے واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت عباسیہ، بغداد کے تنزل اور عجمی حکومت کے ظہور وعروج کے ساتھ ہی علماء کی آراء میں بھی تدریجی تغیر شروع ہو گیا تھا اور اشتراط قرشیت میں وہ زور باقی نہ رہا تھا جو قاضی عیاض وغیرہ کی مصنفات میں پایا جاتا ہے۔ اکثر علماء نے جب دیکھا کہ "ما اقاموا الدین" کی شرط کا ظہور شروع ہو گیا ہے اور حکومت قریش کے قبضہ سے نکل گئی ہے تو ان کی رائے بدل گئی اور قاضی عیاض والے اجماع کے دعوے میں تامل کرنے لگے۔ علامہ ابن خلدون (المتولد سنہ ۷۳۲) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لما ضعف امر قریش، وتلاشت عصبیتهم بما نالهم من الترف والنعم وبما انفقتهم الدولت فی

سائراقطارالارض عجزواعن حمل الخلافة وتغلبت عليهم الا عاجم وصارالحل والعقد لهم فاشتبه ذلک علی کثیر من المحققين، حتی ذهبوا الی نفی اشتراط القرشية وعولوا علی ظواهر فی ذلک مثل قوله صلعم :اسمعوا واطيعوا وان امر عليکم عبد حبشی مااقام فيکم کتا ب الله" یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہوگئی۔ عیش پرستیوں میں پڑکر اپنی عصبیت مٹادی۔ خلافت کا بوجھ اٹھانے سے عاجز ہو گئے تو عجمیوں نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قرشیت کی شرط مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کردیا۔ انتہا

اشاعرہ کے امام الائمہ قاضی ابوبکر باقلانی نے بھی یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قرشیت کی شرط ضروری نہیں۔ یہی ابن خلدون لکھتے ہیں۔"ومن القائلين بنفی اشتراط القرشية القاضی ابوبکر الباقلانی"

عباسیہ بغداد کے انقراض کے بعد مصر میں عباسی خلافت کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس لیے اس عہد کے علماء مصر نے (مثلاً حافظ ابن حجر، قاضی عینی، جلال الدین سیوطی وغیرہم) قرشی خلافت کو فی الجملہ قائم پایا۔ لیکن جب یہ نقش بھی مٹ گیا اور وہ زمانہ آیا جس کی خبر دے دی گئی تھی کہ" بعث الله عليکم من يلحاکم کما يلحی القضيب". تو جو اہل نظر اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ اشتراط قرشیت کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ خلافت قریش کا وہ مطلب ہے جو اب تک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تیرہویں صدی کے مشہور مجدد وفقہ وحدیث امام شوکانی یمنی "وبل الغمام" میں شرط قرشیت کے دلائل نقل کر کے لکھتے ہیں۔"لاريب ان فی بعض هذه الالفاظ مايدل علی الحصر ولکن قد خصص مفهوم الحصر احاديث وجوب الطاعة لغيرالقرشی."الی ان قال " والاخبار منه صلعم بان الائمة من قريش هو کاالاخبار منه بان الاذان فی الحبشه والقضاء فی الازد، وماهوالجواب عن هذا، فهوالجواب عن ذلک وتخصيص کون الائمة من قريش ببعض بطونهم لايتم الا بدليل والاخذ بما وقع عليه الاجماع لا شک انه احوط واما انه يتحتم المصير اليه، فليس بواضح، ولوصح ذلک، لزم بطلانّ اکثر مادرنوه من المسائل والمقام والمراکز، وماحقه بان لايکون کذلک"

یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایت میں ایسے الفاظ ہیں جن سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے لیکن وجوب طاعت امام کے جو عام احکام کتاب وسنت میں موجود ہیں وہ دلالت کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی اطاعت امت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ آنحضرتؐ نے قریش میں امامت کی

خبر دی، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا امام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ویسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبر دی کہ اذان کا کام اہل حبش میں ہے اور قضا ازدیوں میں۔ جس طرح ان روایتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ موذن اور قاضی صرف حبشی اور ازدی ہی ہونے چاہئیں، اسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے، جو جواب ان کا دیا جائے گا وہی اس کا ہوگا۔

یہ واضح رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع ثابت کیا جاتا ہے، وہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی قائم تھی بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے انہی سے لیا ہے۔ سب سے زیادہ اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے جن کا قول نواوی نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے ان کا سال وفات ۵۴۴ھ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو وسعت اختیار کر لی ہے اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی و اصولی معنی سے ہٹ کر مختلف مصطلحہ معنوں میں ہونے لگا ہے، اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے علی الخصوص فقہاء مذاہب کے استعمالات متکلمین اور ارباب اصول کے مصطلحہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر مذہب کے فقہا بلا تامل اپنے مسلک کو "جمہور" اور "اجماع" کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس میں کسی کا مطلب کچھ ہوتا ہے کسی کا کچھ۔ صاحب ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم وجوب قرأت فاتحہ خلف امام اور افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے بعضوں نے اجماع تک کہہ دیا لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قرأت فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی پر جماہیر علماء کا اتفاق ہے۔ انہی حافظ نواوی کی (جو اشتراط قرشیت کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں) شرح مسلم دیکھ لی جائے کہ کس طرح شافعیہ کا ہر مذہب ان کے نزدیک "جمہور" کا مذہب ہے اور مخالف کا ہر قول شاذ۔ شافعیہ اور حنفیہ کی خلافیات میں تقریباً دو تہائی مسائل تو ضرور ایسے ہوں گے جن کی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے۔ "هذا مذهب الشافعي والجماهير، وخالف فيه ابو حنيفه" یعنی امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے مگر امام ابوحنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اگر ہمارے علماء احناف حافظ نواوی کی ان تمام جمہوریات و اجماعیات کو تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہیں تو خیر اشتراط قرشیت کا ایک اجماع اور سہی لیکن یاد رہے کہ یہ وہی بات ہوگی کہ:

گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

ثانیاً ہمارا خیال ہے کہ یہ بات بھی اور بے شمار باتوں کی طرح وقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ معاملہ خلافت ابتداء سے سخت کش مکش و تزاحم میں رہا۔ جو خاندان قابض ہوا اس کو رقیبوں اور دعوے داروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہا۔ پس جبکہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی تو وہ

کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ عجمیوں کے ولولوں کی اس بارے میں جرات افزائی کی جائے اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا تو وہ کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کر کے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جائے۔ بخاری کی روایت میں پڑھ چکے ہو کہ امیر معاویہؓ نے قحطانی بادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس درجہ مضطرب اور غضب ناک ہوئے اور کس طرح فوراً قریش والی روایت کا اعلان کر دیا تا کہ پہلے ہی سے سدباب ہو جائے۔ جن علماء کے اقوال پر متاخرین فقہاء و متکلمین کا اعتماد ہے وہ سب کے سب وہی ہیں جن کا ظہور آخر عہد عباسیہ میں ہوا ہے جب قرشی خلافت قائم تھی۔ مثلاً قاضی عیاض و امام نودی وغیرہم۔ پس وقت کی حکومت کا جو پولیٹکل اثر سب پر پڑ رہا تھا وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد و رائے کو دخل ہو، فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر اسی جانب ہو جائے علی الخصوص جبکہ اس کے لیے کسی غلط بیانی یا تحریف احکام کی بھی ضرورت نہ تھی۔ واقعی احادیث موجود تھیں صرف مفہوم کے تعین میں اجتہاد کو کام کرنا تھا اس مسئلہ پر موقوف نہیں، وقت کے پولیٹیکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں اور آج ان کا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا تو آہستہ آہستہ اس اثر سے افکار خالی ہونے لگے اور بتدریج بحث و نظر کی صورت دوسری ہو گئی حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی یا نویں کے اوائل میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں ان کے مباحث پڑھو تو قاضی عیاض اور نوادی سے ان کا رنگ مختلف نظر آئے گا۔

قاضی عینی بخاری کی حدیث معاویہ ''ما اقاموا الدین'' کی شرح میں لکھتے ہیں: ''ای مدت اقامتھم امور الدین. قیل یحتمل ان یکون مفھومہ فاذا لم یقیموہ لایسمع لھم'' یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ ''جب تک دین قائم رکھیں گے'' تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ وقت آ جائے کہ قریش اقامت دین نہ کریں تو ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔ حافظ عسقلانی گو اشتراط قرشیت سے صاف صاف انکار نہیں کرتے لیکن طرز بحث و نظر کے اضطراب و ضعف نے خود بخود مسئلہ کا مخالف پہلو قوی کر دیا ہے اور بہ یک نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی مضبوط رائے نہیں رکھتے اور اگر مائل ہیں تو انکار کی طرف۔ اشتراط قرشیت کے مریدین کے جس قدر دلائل ہیں ان میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں جس پر انہوں نے سنگین اعتراضات نہ کیے ہوں اور وہ مجروح ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ جو صاحب مزید بصیرت حاصل کرنی چاہیں، فتح الباری جلد ۳ کتاب الاحکام کے ابواب ''الامراء من قریش'' اور ''السمع والطاعۃ للامام'' ملاحظہ فرمائیں۔

غرضیکہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر ڈالی جاتی ہے اشتراط قرشیت کے لیے کوئی نص موجود نہیں اگر چہ بصورت اشتراط بھی موجودہ مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں ہے امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے۔

خلافت آل عثمان

چند لمحات تاریخیہ

اب بہتر ہوگا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم آگے بڑھنے سے رک جائیں اور گزشتہ تیرہ صدیوں کی طرف مڑ کے دیکھیں کہ خلافت اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے!

الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ "میرے بعد خلافت خاصہ تیس (۳۰) برس تک رہے گی، کی خبر کے مطابق خلفاء راشدین کا دور ۳۰ برس تک رہا۔ ۱۱ھ سے شروع ہوا اور ٹھیک ۴۱ھ تک باقی رہا۔ اسی سنہ سے بنو امیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہتا ہے اس کے بعد خلافت نے ایک نیا ورق الٹا اور خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی ہے جو ۱۳۲ھ سے ۶۵۲ھ تک قائم رہا۔ چونکہ کامل پانچ صدیوں تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی اس لیے وہ تمام ذہنی وجسمانی اور اجتماعی ومدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے جو ہمیشہ امتداد سلطنت اور عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں۔ قریش کی نسبت فرمایا تھا۔ "**ماقاموا الدین**" جب تک وہ دین قائم رکھیں گے حکومت انہی میں رہے گی۔ سو اب ٹھیک ٹھیک وہ وقت آ گیا تھا، قریش وعرب میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ قیام دین کا کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں پس وہی ہوا جو تاریخ عالم کے ہر ایسے دور میں ہوتا آیا ہے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم باللہ کے خون نے بہہ کر ہمیشہ کے لیے عربی وقرشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ مستعصم کا قتل فی الحقیقت عربی خلافت کا قتل تھا!

وما کان قیس هلکه هلک واحد

ولکنه بنیان قوم تهدما

یہ سب کچھ ہو چکا مگر ابھی پیشین گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی۔ یعنی **بقی منهم اثنان**" قریش سے حکومت نکل جائے گی پر حکومت نکل جانے پر بھی ان کی عظمت رفتہ کا یہ اثر باقی رہے گا کہ اگر دو قریشی بھی کسی گوشہ میں نکل آئیں گے تو لوگ خلافت کا انہی کو مستحق مانیں گے۔ بغداد میں قرشی خلافت مٹی، لیکن مٹتے مٹتے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی۔ وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اکھڑا اور تین سو برس

تک کے لیے مصر میں جا کر جم گیا۔ البتہ یہ جماؤ قریشی حکومت کا جماؤ نہ تھا محض اس کے نقشِ قدم کا تھا۔

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

عباسی خاندان کے دو چار آدمی بغداد کے قتل عام سے بچ کر نکل گئے تھے۔ ان ہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا۔ وہ ۶۶۰ھ میں مصر پہنچا۔ وہاں ایوبی خاندان کے ممالک کی حکومت قائم تھی اور ملک ظاہر بیبرس حکمران تھا۔ اس کو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار تسلیم کر لیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

احمد بن ظاہر نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور بیبرس کی معیت و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کی کہ دار الخلافت بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلائے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا۔

اب پھر وہ وقت آ گیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انتساب بالکل معدوم ہو جائے لیکن "مابقی منهم اثنان" کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھلانے والی تھی۔ قتل عام بغداد سے ایک اور عباسی شہزادہ ابو العباس احمد بن علی بچ کر نکل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا۔ اس کا حال بیبرس کو معلوم ہوا تو بڑے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حاکم بامر اللہ کے لقب سے وہ مشہور ہوا۔ اور اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ برس تک قائم رہی۔ یعنی ۶۶۰ سے سنہ ۹۲۳ ہجری تک۔

اس عرصہ میں عالم اسلامی دو صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے تہ و بالا ہو کر بالآخر ایک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا۔ عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ اور ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ مسیحی) میں سلطان سلیم خاں اول نے مصر و شام پر قبضہ کیا اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت اس کے سپرد کر دیے۔ حقوق خلافت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ حرمین کی کنجیاں تھیں اور بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرتؐ کی تلوار، جھنڈا، ایک چادر یہ آثار اس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں۔ اسی تاریخ سے عثمانی سلاطین نمایاں طور پر "خلیفہ" کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور حجاز اور مصر و شام کے منبروں پر ان کا ذکر بہ حیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا۔ حج کی امارت بھی انھی کے قبضہ میں آ گئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

سلسلہ خلافت کی یہ ایک مجمل تاریخ ہے۔ بالفرض خلیفہ متوکل عباسی نے سلطان سلیم کے ہاتھ

پر بیعت نہ کی ہوتی جب بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام عالم اسلامی کی خلافت کا منصب عثمانی سلاطین ہی کے قبضہ میں آ جائے۔ وقت کی جو اسلامی سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع وملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی ہو، وہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے گزشتہ چار صدیوں کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا؟ خود ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت قائم تھی۔ وہ ہندوستان کے اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے لیکن عالم اسلام کی خلافت عظمیٰ کا دعویٰ کبھی ان کے واہم وخیال میں بھی نہیں گزرا اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک مقام خلافت کی جو اہم و مشترک خصوصیات رہی ہیں اور جن کو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً بطور اسناد خلافت کے تسلیم کر لیا ہے، وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئی۔ کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار واختیارات کے ساتھ قائم نہ ہو سکی۔

حواشی

۱ؔ تا تار کا ظہور مسلمانوں کے لیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل کے لیے بخت نصر کے ظہور میں بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۱۷:۵) به حکم یاتی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل (صحیحین) اس امت پر بھی وہ سب کچھ گزرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گزر چکا۔ بنی اسرائیل پر غفلت وضلالت کے دو سب سے برے دور آئے۔ اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی بھی چھائی اور ان کی تہذیب کے لیے دو جابر و قاہر قومیں مسلط ہوئیں: وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا" (۱۷:۴) پہلی بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ عبادا اولی باس شدید۔ اور دوسری طیطس قیصر روم کے ہاتھوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت پر بھی طغیان وعصیان کے دو بڑے وقت آنے والے تھے اور ان کے نتائج دو معذب قوموں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ قوم تا تار اور اقوام یورپ، بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیا ہی کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی۔ یعنی اہل بابل کے ہاتھوں اور دوسری کا ظہور یورپ سے ہوا۔ یعنی روم سے ٹھیک اسی طرح اس امت کے لیے بھی پہلا فتنہ ایشیا کا تھا۔ دوسرا یورپ کا۔ پہلا ہو چکا۔ دوسرا ہو رہا ہے۔

خلافت وامامت سلاطین عثمانیہ

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں۔ سلطان سلیم خاں اول کے عہد سے لے کر آج تک بلانزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ وامام ہیں۔ ان چار صدیوں کے اندر ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں اٹھا۔ بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے عہدوں میں بے شمار رقیبوں اور دعویداروں کی کش مکش نظر آتی ہے۔ لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدعی خلافت کا نام بھی ڈھونڈ کر نہیں نکالا جاسکتا حکومت کے دعویدار سیکڑوں اٹھے ہوں مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعوی کوئی نہ کرسکا۔

صدیوں سے اسلام و بلادِ اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے اور صرف انہی کی لاشیں اسلام کے لیے خاک وخون میں تڑپتی ہیں۔ اور صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار سونپ رکھا ہے۔ دنیا کے خواہ کسی گوشہ میں کوئی مسلمان ہو اگر وہ بحیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کے لیے نکلتا ہے تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہو کر اس کو عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بھیجے ہوئے نائب کے ماتحت انجام دیتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم محاربین کا ساتھ دے کر اگر بغاوت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کرلیا تو یہ فساد وعدوان کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں۔ حجاز حکماً اب بھی خلیفہ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جز ہے اور تمام مسلمانان عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک بغاوت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے اگر ایسا نہ کریں گے تو ہر مسلمان اس کے لیے عنداللہ جواب دہ ہوگا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام وعیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے بستر پر سونے کے لیے ہیں۔ لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت وزندگی کے بچاؤ کے لیے صدیوں سے تلوار کے سائے تلے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ کامل پانچ صدیوں سے یورپ اور ایشیا کا سب سے بڑا رقبہ ان کے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک ایسی نہیں گزری کہ دشمنوں کی تلواروں نے انہیں مہلت دی ہو۔ ان کا جرم اس

کے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کوئی نہ رہا۔ ساری تلواریں ٹوٹ گئیں سارے بازو شل ہو گئے تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کے لیے باقی ہیں؟ اور کیوں وہ وقت آنے نہیں دیتے جب اسلام کی پولیٹیکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے؟

بدوستی تو خصمند عالمے با من
ہزار دشمن ویک دوست مشکل افتاد است

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق وہی آج تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ وامام اور "اولا الامر" ہیں ان کی اطاعت و حمایت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ ان سے پھرنا اور ان کو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا اللہ اور اس کے رسول سے پھرنا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو اپنی جان و مال کی طرف سے صاف جواب دے دینا ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا اگرچہ صرف بالشت بھر باہر ہوا ہو، اور اسی حالت میں مر گیا اس کی موت اسلامی زندگی کی موت نہ ہوگی بلکہ جاہلیت کی موت ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو جس نے ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی وہ مسلمانوں میں سے نہیں اگرچہ دنیا اس کو مسلمانوں میں سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت، اس کی شریعت کی ان گنت اور بے شمار دلیلیں، ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ، اسلام کی سینکڑوں نسلوں اور لاتعداد گھرانوں کا تعامل واجماع اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت یہی بتلا رہی ہے اور ہر مسلمان کے دل پر نقش ہے۔ ایک مسلمان کے لیے بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو اور دنیا سے ایک مومن کا اعتقاد و عمل ساتھ لے کر جانا چاہتا ہو اس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ جاہل سے لے کر عالم تک، مزدور سے لے کر نظام دکن تک کوئی نہیں جس کا دل اس اعتقاد سے خالی ہو۔ زندگی کا عشق اور نفس کی پرستش جس انسان سے چوری کرا لیتی ہے، ڈاکے ڈلواتی ہے، قتل کراتی ہے، اس انسان سے کیا بعید ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے؟ دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی درد انگیز مثالوں سے لبریز ہے۔ پس یہ کوئی عجیب واقعہ نہ ہوگا اگر آج چند نئی مثالوں کا مزید اضافہ ہو جائے۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو چھپایا نہیں جا سکتا اس سے اغماض کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس سے آنکھیں بند کر لی جا سکتی ہیں لیکن اس کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔

ہم یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی کارگزاریوں کی بحث نہیں چھیڑیں گے۔ ہم کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمران جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت وہ بدقسمت جماعت ہے جس کے لیے

کوئی یوروپین دماغ منصف نہیں ہوسکتا۔ یورپ کا پچھلا مورخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا مدبر، وہ گزشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کرسکتا ہے جواب موجود نہیں ہیں لیکن ان ترکوں کی نہیں کرسکتا جن کی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کے لیے چمکتی رہی ہیں۔
وہ خلافت بنوامیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے، عباسیہ کے دورِ علم و تمدن کی مدحت سرائی کرسکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بت کی طرح پوج سکتا ہے لیکن وہ ان ترکوں کے لیے کیونکر انصاف کرسکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع ہوئے، نہ ایران و عراق پر، نہ شام و فلسطین کی حکومت ان کو خوش کرسکی، نہ وسط ایشیا کی بلکہ تمام مشرق سے بے پرواہو کر یورپ کی طرف بڑھے، اس کے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کرلیا اور اس کی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دارالحکومت آسٹریا کی دیواریں ان کے جولانِ قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں!
ترکوں کا یہ وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں کا ہر وہ حکمران اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہوسکا مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے اس لیے کہ یورپ کا طلسمِ سطوت اس کی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔
ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے ساتھ حکومت کی ہے، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ویسی ہی زندہ و توانا رہی جیسی کسی متعصب سے متعصب مسیحی حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد خود مختار ہوگئے اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ رہے ہیں۔
ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے ہیں جن کے آباؤ اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمران تھے۔ صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرزِ حکومت اور ترکوں کے طرزِ حکومت کا فرق واضح کردینے کے لیے کافی ہے۔
ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ دہشت ناک ہلاکتیں نہیں آسکتیں جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور بت عین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں ایشیا و افریقہ کے اندر کرچکا ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے درندے آرام کی نیند سوئے اور سانپوں کو ان کی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا، لیکن ایشیا و افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ بچ سکا جس کو وہاں کی بدبخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کرسکے۔

خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح چیرا، پھاڑا اور ہر سفید بھیڑیے نے دوسرے سفید بھیڑیے پر جس طرح پنجہ مارا نہ صرف ترکوں کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

بایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے۔ علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بستے ہیں وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کے لیے آسمان سے اتارے گئے ہیں!

یہ کرہ ارض کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے۔ آج اس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ جو خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا اور مورخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جاسکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۶۲:۳۳)

بہرحال ہماری بحث سے یہ موضوع باہر ہے۔ ترکوں کی حکمرانی جیسی کچھ بھی رہی ہو ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے اشرار بنو امیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے اور ان کا از روئے شرع بھی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفۂ اسلام ہیں۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں۔

نمی دانم زمنع گریہ مطلب چیست ناصح را

دل از من دیدہ از من آستین از من کنار از من

حواشی

۱؎ آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حریف حکومتوں کے ان مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔ پس امید نہیں کہ ڈریپر (Draper) جیسے زمانہ حال کے مؤرخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے۔ امریکن

مصنف اپنی مشہور کتاب History of the Conflict Between Religion and Science میں لکھتا ہے کہ انصاف وعدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطائن پر حاصل تھی۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب وتمدن اور علمی ایجادات واختراعات کے لحاظ سے پندرھویں اور سولھویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے انسائکلوپیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے کا ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا۔ یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائکلو پیڈیا ڈالامبرٹ (Delembart) نے لکھی۔ لیکن اس کو ایک ترک مصنف کلبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی۔ کمسریٹ، رسدرسانی اور فوجی شفاخانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے۔ فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا۔ چیچک کے ٹیکے کا اصلی موجد ایک ترک تھا۔ ڈریپر کریسی، کنگنڈم کلفرڈ وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے۔ جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی۔ قدرتی طور پر مسٹر الیکو۔تھ اور مسٹر لائڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں اور کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

مسلمانان ہند اور خلافت سلاطین عثمانیہ

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی ہندوستان کے تمام حکمران خاندان اسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے۔ عباسیہ بغداد کی خلافت جب مٹ گئی اور ۶۶۰ھ میں مصر کی عباسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ یہ عباسیہ کے کاروانِ رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا، تاہم تمام سلاطینِ ہند اس کی حلقہ بگوشی وغلامی کو اپنے لیے موجب فخر و امتیاز سمجھتے رہے اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوانے کے لیے مقام خلافت سے پروانۂ نیابت حاصل کرتے رہے۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ کے غرور حکومت کا یہ حال تھا کہ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی اس کو "ہمت فرعونی ونمرودی" سے تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ غرور جو وہ کرسکا، یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفۂ مصر کا سب سے بڑا فرمانبردار غلام اور چاکر ظاہر کرے اور رعایا کو یقین دلائے کہ بلا اس کے حکم میں تم پر حکومت نہیں کرتا۔ تاریخ برنی میں ہے۔

"امیر المومنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود، بے امر وبے فرمان اودست در امور اولوالامری نہ زد" (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی صفحہ ۴۶۰)

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل وسوانح کے لیے گیارہ مقدمیں ترتیب دیے ہیں۔ ان میں نواں مقدمہ یہ ہے۔

"مقدمہ نہم در آنکہ دوکرت از حضرت امیر المومنین خلفنا ولی الامری منشور اذن لوائے شاہی برسلطان عصر فیروز شاہ رسیدہ، وبادشاہی واولوالامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ۔"

پھر اسی مقدمہ میں لکھتا ہے۔

"در مدت شش سال دوکرت از امیر المومنین منشور اولوالامری وخلعت شاہی ولوائے سلطنت بدو رسید، وحق جل وعلی پادشاہ دین پرور مارا درعزت داشت منشور وخلعت وفرستادگان را توفیق بخشید و شرائط حرمت مراحم امیر المومنین بالغا بلغ بجا آوارد وہم چنیں دانست کہ منشور وخلعت امیر المومنین از آسمان منزل شدہ واز درگاہ مصطفیٰ صلعم رسیدہ عرض داشتے باتحفہ وہدایا درنہایت تواضع بندگی امیر المومنین رواں کردانخ (صفحہ ۵۹۸)

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل ومفاخر میں سے ایک بڑی بات یہ بھی گئی کہ خلیفۂ مصر نے اجازت حکومت کا پروانہ اور الوا وخلعت بھیجا اور بادشاہ کو اس کی اطاعت وحرمت کی توفیق ملی۔ فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی اور خود بارگاہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو قبولیت کی سند مل گئی ہے!

شمس الدین سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب خلیفہ کے سفراء شہر کے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کے لیے پیدل نکلا۔ فرمان خلافت کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر بوسہ دے کر سر پر رکھا اور اسی طرح سر پر دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا۔

غور کرو! مقام خلافت کی عظمت وجبروت کا اثر کس درجہ عالمگیر رہا ہے؟ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف برائے نام نسبت اس درجہ ہیبت وجبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے دور دراز گوشہ میں ایک عظیم الشان فرمانروائے اقلیم، اذن واجازت ہو جانے پر فخر کرتا ہے اور مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالم اسلام پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرماں آسمانی فرمان اور وہاں کا حکم بارگاہ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے۔

مغلیہ سلطنت خلفاء مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں بابر شاہ کی قسمت آزمائیوں کا زمانہ تھا۔ جب سلطان سلیم خاں (ترکی) کے ہاتھ پر خلیفہ متوکل عباسی نے بیعت کی اور حجاز و شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا۔ شاہان مغلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے اور باعتبار حکومت یہ حق انہیں حاصل بھی تھا، تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دعوے نہ کیا۔ ہمیشہ عرب وشام کے مسلمہ خلفاء ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ شہنشاہ اکبر اور شاہجہان بھی اگر حج کے لیے جاتے تو ان کو قسطنطنیہ کے خلیفہ ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا۔ میدان عرفات میں وہ خود خطیب نہ ہوتے۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا۔ وہ کھڑے ہو کر اسی طرح سنتے جس طرح ایک عام مسلمان ان کے بغل میں کھڑا سن رہا ہوتا۔ شرعاً وعقلاً تسلیم خلافت کے لیے اس سے زیادہ اور کون سی بات ہو سکتی ہے؟

بعض یوروپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کی سعی سے پیدا ہوا اور ان کا مقصود اس سے یہ تھا کہ نام نہاد "پان اسلامزم" تحریک کو تمام مسلمانان عالم میں پھیلا دیا جائے یہاں ہم یورپ کے موعومہ ومتوہمہ "پان اسلامزم" کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ "پان

اسلامزم" سے اگر مقصود مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن وقومیت باہمی برادری ہے تو اس کی تاریخ سلطان عبدالحمید کے زمانے سے نہیں بلکہ نزول قرآن وظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد کو سلطان عبدالحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد درجہ جہل کا نتیجہ ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا اور ہم نہیں جانتے کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کے لیے استعمال کریں۔ ۹۲۳ھ میں جب بعہد سلطان سلیم خاں سلاطین عثمانیہ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیے گئے تو اس وقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین صفویہ کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ کی، اندرون یمن میں ائمہ زیدیہ کی اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ کی۔ پس جہاں جہاں اسلامی حکومتیں موجود تھیں، وہاں کے مسلمانوں کی اطاعت وانقیاد کا محل ومرکز خود مقامی اسلامی حکومت ہوگئی تھی اور احکام شرعیہ کے نفاذ واجراء کے لیے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے محتاج نہ تھے۔ اس بناء پر ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا تعلق کسی نمایاں شکل میں یکا یک ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔ سلطنت کے رقیبانہ جذبات بھی اپنی انتہائی حالت میں سب پر چھائے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے سے تفرقہ وانتشار کی عالمگیر معصیت تمام عالم اسلامی کو ٹکڑے ٹکڑے کرچکی تھی۔ لیکن ان ممالک کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ ترکی حکومت سے کتنے ہی دور ودراز گوشوں میں واقع ہوں لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمٰی پر فائز ومتصرف تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے جمعہ و عیدین کے خطبوں میں ان کے لیے خاص طور پر دعا مانگنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفہ قسطنطنیہ کی حیثیت دینی کا پورا پورا اعتقاد رکھتا تھا۔

جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں۔ ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۱ء میں دکن کے مشہور عالم سید قمر الدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کے معاصر ہیں۔ اپنی کتاب سبحۃ المرجان میں ان کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں ڈچوں کی حکومت ہے۔ اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے۔ کولمبو میں مسلمانوں کے دو محلے ہیں۔ جمعہ کی نماز تین مرتبہ سید موصوف نے وہاں پڑھی۔ خطبہ میں امام نے پادشاہ ہند اور سلطان قسطنطنیہ کے لیے دعا مانگی تھی۔ لکونہ خادما للحرمین الشرفین" یعنی اس لیے کہ وہ خادم حرمین ہیں (سبحۃ المرجان مطبوعہ ممبئی صفحہ ۴۳)

یہ اب سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستان ان سے بالکل متصل تھا لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کے لیے دعا مانگنا جو بحر ہند سے اس قدر دور دراز فاصلہ پر واقع ہے، کیا

معنی رکھتا ہے؟ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام عالمِ اسلام میں وہی خلیفۃ المسلمین ہے اور اس لیے گو اور بھی بہت سی اسلامی حکومتیں موجود ہوں، مگر ہر گوشہ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے؟

صاحب تحفۃ العالم چین کو چک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا۔ ''چین کو چک'' سے مقصود بحر چین کے جزائر سماٹرا، ملایا جاوا وغیرہ ہیں۔ سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں اور مسجدیں معمور ہیں۔ جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کے لیے دعا مانگتے ہیں اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ یہ واقعہ بھی بارھویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطینِ عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیداوار ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی، کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ البتہ سلطنت مغلیہ کے انقراض کے بعد وہ مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتہ انقیاد و عقیدت قائم کر لیں۔ تاہم اسلام کی مرکزی خلافت پر سلاطین عثمانیہ کا قابض ہونا ایک ایسی مسلم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات ۱۱۷۴ھ ہے۔ ان کا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا۔ اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انہوں نے تفہیمات الٰہیہ میں دو جگہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''از زمان سلطان سلیم خاں کہ در اوائل سنہ الف بود، اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین توم اند، و خدمت الحرمین الشریفین زادھما اللہ شرفاً و کرامۃً، و امارت موسم و ریاست حجاج، و اہتمام محامل و قوافل برایشیان استقرار یافت و بہ ہمیں جہت بر منابر عرب و شام خصوصاً حرمین الشریفین ہر یکے ازا ایشان بہ لقب امیر المومنین مذکور ست''

یمن میں اگرچہ ائمہ زیدیہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے اور انہوں نے اندرون ملک میں کبھی ان کی حکومت جمنے نہ دی۔ بایں ہمہ گیارھویں سے تیرھویں صدی تک علمائے یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، ان سے پوشیدہ نہیں کہ اکثروں نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے۔ جس کے معنی بجز خلافت اسلامیہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامہ صالح مقبلی صاحب العلم الشامخ المتولد ۱۰۴۷ھ علامہ فلانی صاحب ایقاظ الہمم، شیخ عبدالخالق زبیدی صاحب صفوۃ الاخبار وغیرہم اپنی کتابوں میں جابجا ترکی گورنروں کے جبر و ستم کی شکایتیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطینِ عثمانیہ کا ذکر ایسے

پیرایہ میں کرتے ہیں جس سے ان کی اسلامی خلافت و امامت کا مسلم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کرکے یہ کہنا کہ جو شخص آج روئے زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلائے اس کے گورنر اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سلاطین عثمانیہ تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام تسلیم کیے جاتے تھے۔

یہ موقع مزید اطناب و تفصیل کا نہیں ہے۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ دسویں صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اس کا ذکر مل سکتا ہے تو پچھلی تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علمائے ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں اس لیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو جا سکتا ہے۔

خود یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ سے اقرار کرتی آئی ہے اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے قسطنطنیہ کی طاقت سے بہ حیثیت خلیفۂ اسلام کے کام لیا گیا ہے۔ غدر ۵۷ء کے موقع پر سلطان عبدالمجید سے جو فرمان مسلمانانِ ہند کے نام حاصل کیا گیا تھا اور جس میں ان کو انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کی بنا بھی یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام مسلمانان ہند کی ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے۔ کوئین وکٹوریا کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اٹھایا گیا اور پھر امپیریل گورنمنٹ نے جناب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ توجہ دلائی کہ بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے حجاج کی تکلیف دور کرنا ان کا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں متعدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعترافات ہو چکے ہیں۔

قرون متوسطہ واخیرہ میں مرکزی حکمرانی

ہم نے جابجا "اسلام کی مرکزی حکمرانی" اور "خلافت عظمیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور واساس مسئلہ "توحید" ہے۔ "توحید" کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہونا۔ صرف اللہ کی ذات وصفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہ تھی جیسا کہ بدقسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ عقائد واعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام ان باتوں میں جو فرد واجتماع سے تعلق رکھتی ہیں ایک کامل توحیدی حالت پیدا کردینا چاہتا ہے۔ جس طرح خدا کی ذات کی طرح اس کی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز اور ہر جگہ یگانگی ویک عملی اور وحدت و واحدیت کارفرما ہے۔ "مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷:۳)

اس بناء پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں ان کی شریعت، ان کا قانون، ان کی کتاب، ان کا نام، ان کی زبان، ان کی قومیت، ان کا قبلہ، ان کا کعبہ، ان کا مرکز اجتماع، مرکز ارض، اسی طرح ان کی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی۔ یعنی تمام روئے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو۔ لیکن جہاں ساری باتوں میں انحراف اور تفرقہ وانتشار رہا وہاں یہ بات بھی جاتی رہی۔ خلفاء راشدین کے بعد صرف بنوامیہ کے ابتدائی عہد تک وحدت حکومت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جب تمام عالم اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو۔ مختلف گوشوں میں مختلف دعویدار اٹھے اور جس کا قدم جہاں جم گیا، خودمختارانہ فرمانروائی کرنے لگا۔

بایں ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرت محسوس کرلیتی ہے کہ اس تفرقہ وانتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے۔ اسلامی حکومتیں ہر گوشہ عالم میں قائم ہوگئی تھیں مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا جہاں کی حکمرانی دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے لیکن وہاں کا حکمران تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص کشش ودعوت اپنے اندر رکھتا تھا۔ یہ بلاد شام وعراق اور عرب وحجاز کی حکومت تھی۔ عرب اسلام کا اصلی

سرچشمہ ومبدا ہے۔ حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے رُکن حج کی بارگاہ ہے۔ شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھی جائے۔ شریعت کے اس حکم کی تعمیل بغیر حکومت کے ممکن نہیں جو حکومت اس پر قابض ہوگی وہی اس شرعی حکم کی تعمیل ونفاذ کی ذمہ دار اور اقامت حج کی بھی کفیل ہوگی۔ پس قدرتی طور پر یہ بات ہوئی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں مرکزی اقتدار اور تمام مسلمانانِ عالم کے قلوب کے لیے ایک انجذابی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے ازمنۂ متوسط وا خیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافت عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصر کے قبضہ میں رہی۔

''مرکزی حکومت'' سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطین عثمانیہ تمام بلاد عرب وحجاز اور مصر وشام پر قابض ہو گئے تو اسلامی خلافت عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلانزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دسویں صدی کے بعد سے تیرھویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بڑی بڑی اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اٹھتی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

ترکانِ عثمانی اور عالمِ اسلامی

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کرلیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکام شرعیہ کی بنا پر سلاطین عثمانیہ کے اعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے۔ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ سہل فیصلہ ہوگا۔

اسلام نے خلیفہ کے نصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیئے ہیں۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں اور اب تک موجود ہیں۔ قوم و جماعت کے اعتبار سے متعدد مسلمان قوموں میں حکومت رہی اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران جماعتوں میں کون سی حکومت ایسی ہے جس نے شریعت کے ٹھہرائے ہوئے مقاصد خلافت انجام دیئے؟ اور جو غرض شرعی خلیفہ کے قیام او بہ حکم ''الذین ان مکنا ھم فی الارض'' تمکین فی الارض سے تھی، وہ ان کے ہاتھوں پوری ہوئی؟ جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمان عالم کی خلافت و امامت کا دعویٰ کرسکتی ہے۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطروں میں ہوسکتا ہے۔ ''خلافت اسلامیہ'' کا مقصد شرعی پچھلی صحبتوں میں صاف ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں کے حملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کرسکے۔ اسلام و ملت کے دشمنوں کا استیصال و انسداد ہو۔ کلمہ حق دنیا میں بلند اور دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے۔ کلمہ کفر و فساد کو خسران و ناکامی نصیب ہو۔ یہی مقصد پہلا مقصد ہے باقی سب فروع و توابع ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے ''اقامۃ الدین باقامۃ ارکان الاسلام، والقیام بالجھاد، و حفظ حدود الاسلام وما یتعلق بہ من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلہ'' کے جملے سب سے پہلے ملتے ہیں۔ یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو ارکان اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے اور ان کاموں کے لیے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو، اس کا انتظام کرے مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہوسکتا ہے جو اسلام و ملت کے لیے دفاع و جہاد کی خدمت

انجام دے سکے۔ ساری باتیں ان دو لفظوں میں آ گئیں۔

اب فیصلہ کرلو کہ گزشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم نے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دی ہے؟

اسلام کا جب ظہور ہوا تو دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت تھی۔ ان کے مٹ جانے کے بعد ان پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں کی دائمی حریف رہی ہیں۔ دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا داعیہ رکھتی ہو۔ ایران کی مجوسی قوت کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہودیوں کی کوئی پولیٹیکل قوت نہ تھی۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروؤں نے ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ ان میں کوئی داعیانہ قوت تھی۔ چین کے تاتاری اٹھے اور بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت کا باعث ہوئے لیکن بالآخر خود اسلام کے محکوم ہو گئے یعنی ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان ہو گئے۔

پس تمام رُوئے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے اور کوئی حملہ آور حریف اسلام کا نہ تھا۔ نہ ہے؟ مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتدا ہی میں شکست کھا گئی تھی۔ صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جن کو خواہ مسیحیت کے نام سے موسوم کرو خواہ یورپ کے نام سے۔ یہی آخری چار صدیوں میں جن میں بتدریج یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی اور اس کی ترقی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کو روز بروز تنزل ہوا۔

تمام کرۂ ارض کے مسلمانوں میں سے کون سی قوم ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر یورپ کا مقابلہ کیا ہے اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی ان کے سب سے بڑے حریف کے مقابلے میں حفاظت کی ہے؟ سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کی ان تمام طاقتوں نے جو مشرقی ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں بتدریج قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اگر کوئی طاقت در اور متصادم روک موجود نہ ہوتی تو اب سے دو صدی پیشتر ہی تمام وسط ایشیا شام، عرب اور اسلامی افریقہ یورپ کے استیلاء سے پامال ہو چکا ہوتا۔

پھر وہ کونسی ناقابل تسخیر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے پے در پے حملوں سے تمام یورپ کو اس طرح پامال کر دیا کہ پوری دو صدیوں تک سنبھلنے اور قدم اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی اور پھر تمام ایشیا و بلاد اسلامی کے عین دروازہ پر مغربی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم کر دی اور اس طرح حکم جہاد کے دونوں فرض بہ یک وقت تن تنہا انجام دیئے۔ ہجوم بھی اور دفاع بھی؟

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں ایک بار بھی ہندوستان سے

قدم باہر نہ نکالا؟ اور جس کی تلوار پانچ صدیوں کے اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف ملت کے خون سے رنگین نہ ہوئی؟ عین اکبراعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرتگالیوں اور ڈچوں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوٹ رہے تھے اور وہ ان کے انسداد سے عاجز تھا۔

کیا ایران کے سلاطین نے، جن کے عقبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مندانہ اقدام ترک کر کے ایشیا کی طرف متوجہ ہو جائیں جس کی وجہ سے یکا یک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت مل گئی اور تمام وسط یورپ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔

کیا یمن کے خود مختار قبائل اور عرب کے ائمہ نے، جن کو اسلام کے اس سب سے بڑے حریف کا شاید حال بھی معلوم نہ تھا!

ہر وہ انسان جو دو اور دو کو صرف چار ہی کہنا چاہتا ہو اس کا اقرار کرے گا کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کی کوئی حکومت اور قوم نہیں ہے جس نے قرون اخیرہ میں حفظ اسلام وملت کی یہ خدمت انجام دی ہو اور جو فرض تمام مسلمانان عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا، اس کو سب کی طرف سے تن تنہا اٹھا لیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی نظیر قرون اولے کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمراں قوم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی۔ تاہم وہ بھی ایک محدود زمانے کا دفاع تھا۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام روئے زمین کے مسلمان اپنے سب سے بڑے قومی فرض سے غافل رہے۔ کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اس کے لیے نہیں اٹھایا۔ صرف تن تنہا ترک ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تمام مسلمانان عالم کو عیش وراحت کے بستروں پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک وخون کی دائمی زندگی پسند کی۔ ان قرون اخیرہ میں اگر ترکوں کی جانفروش وسرباز جماعت تن تنہا اس فرض کو نہ سنبھال لیتی تو نہیں معلوم آج جغرافیۂ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اس وقت درپیش ہے وہ کب کی آ چکی اور مسلمانوں پر سے گزر چکی ہوتی؟ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ اگر اس کے معاوضہ میں مسلمانان عالم اپنا سب کچھ ان پر سے قربان کر دیں جب بھی ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اگر گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف انہی کی بدولت اور آج پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پونجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف انہی کی بدولت۔ مسلمان خواہ

دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔ چین میں ہو یا افریقہ کے دور دراز گوشوں میں لیکن صدیوں سے اس کی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کے لیے ہے اور ہو سکتا ہے۔ صرف ترکوں ہی کے طفیل ہے اور انہی کا بخشا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں لیکن ترکوں کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان یا افریقہ میں بانٹنے کے لیے روپیہ بھیجتے رہیں۔ وہ چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جس کے تصور سے بھی ہم مسلمانان ہند کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جس کے وہم ہی سے ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں اس سے بڑھ کر اور کون سا کام ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے بعد کیا رہ گیا جس کی طلب اور سوال ہو! بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں لیکن نماز کے قیام کی راہ میں ان سے زیادہ اپنا خون کسی نے نہیں بہایا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے اس سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف انہی کے سینے کھا رہے ہیں۔ اگر اللہ کی شریعت حق ہے، اگر قرآن و سنت کا فیصلہ باطل نہیں تو ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد مسلمانوں سے جن کے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گزرتا، ترکوں کا ایک گناہ گار معصیت آلود فرد بھی اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے ہماری مدت العمر کی عبادتیں بھی ان کے سینے کے ایک خونچکاں زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرہ خون کی عظمت نہیں پا سکتیں۔ حدیث ہے کہ "حرس ليلة في سبيل الله افضل من الف ليلة بقام لليلها و صيام نهارها"[1] جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے۔

يا عابد الحرمين لوا بصرتنا لعلمت انک فی العبادة تلعب
من كان يخضب خده بدموعه نحورنا بدمائنا تتخضب
ريح العبير لكم و نحن عبيرنا و هج السنابک والغبار الا طيب[2]

جو مسلمان یورپ کے مسیحی و سیاسی اثر سے متاثر ہو کر ترکوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں، ان کو چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے ان کی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا حال رہا ہے۔ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو (جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں) غور کرنا چاہیے کہ جس اولین فرض دینی کے لیے ترک چار سو برس سے اپنا خون بہا رہے ہیں۔ انہوں نے

اس کے لیے کیا کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھار چند لاکھ سکے ترک زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے بھیج دیئے جو ایک ترک بیوہ کی مصیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہوسکتے؟ کیا ایسے لوگوں کو جو اپنی راتیں فارغ البالی کے بستروں پر اور دن آرام و بے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں پر زبان طعن کھولیں جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک وخون میں تڑپا رہے ہیں؟

بہر حال منصب خلافت کا پہلا مقصد قیام دفاع و جہاد ہے۔ وہ پچھلی چار صدیوں میں بجز ترکوں کے اور کسی اسلامی حکومت نے انجام نہیں دیا۔ پس اگر اور دلائل وشواہد نہ ہوتے، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کے لیے کفایت کرتی تھی۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام مبحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گزشتہ صدیوں میں متعدد اسلامی حکومتوں کے رہتے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے؟ لیکن موجود زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مٹ چکی ہیں۔ مسلمانان عالم کے لیے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود نہیں رہا۔

حواشی

۱ اخرجہ الامام احمد عن مصعب بن زبیر

۱ حافظ ابن عساکر نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درس حدیث دیتے ایک سال تجارت کرتے۔ ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے۔ حضرت فضیل اس عہد کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں۔ حاصل ان اشعار کا یہ ہے "اے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تو ہمارا حال دیکھتا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے، وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے رخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) تر کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں رخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں۔ حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور فرمایا "صدق ابو عبدالرحمن، عبداللہ بن مبارک نے سچ کہا!

فریضہ عظیمہ دفاع

حقیقت حکم دفاع

اسلام کے شرعی واجبات و فرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان و کفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض دفاع ہے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (ڈیفنس) کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر بچائیں۔ اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں اور اس کام کے لیے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کریں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں اور اسلامی فرائض میں یہ اس درجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے ناواقف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاوری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں۔ لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی، وہ سورۃ حج میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۰ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۰ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ط (۲۲ ۳۸-۴۰)

اللہ تعالیٰ مومنوں پر سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی نہیں جو اس کی بخشی ہوئی طاقت کے امانتدار نہیں ہیں، اور شکرگزاری کی جگہ کفران نعمت میں سرشار ہیں۔ جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں، اب ان مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ مظلوموں کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیئے گئے۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں!

لیکن بعض مفسرین نے سورہ بقر کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے۔

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ

الْمُعْتَدِیْنَ • وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَ اَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔(۲:۱۹۰-۱۹۱)

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ایسا کرو کہ جہاں کہیں بھی وہ جمے ہوئے ملیں، قتل کردو اور جہاں کہیں سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا ہے تم بھی نکال باہر کرو۔ ایسا کرنا اگرچہ خونریزی ہے مگر خونریزی کی برائی سے بھی بڑھ کر ظلم و فساد کی برائی ہے۔

امام ابن جریر نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت یہی پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی۔ **الھا اول ایت نزلت فی القتال بالمدینۃ فلما نزلت کان رسول اللہ صلعم یقاتل من قاتلہ ویکف عمن کف عنہ، حتی نزلت سورۃ براءۃ**" پس اذن قتال کی پہلی آیت سورہ حج کی ہے یا بقرہ کی۔

ان دونوں آیتوں اور ان کی ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے اس حصہ کو صاف صاف مسلمانوں پر فرض کردیا جس کا مقصد دفاع (ڈیفنس) ہے یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی کوئی جماعت مسلمانوں کی کسی حکومت یا آبادی پر حملہ کرے یا اس پر خود قابض ہوجانا چاہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح حملہ آوروں نے حملہ کیا ہے، یہ بھی کریں، قتل و جنگ کی جو جو چال وہ چلے ہیں یہ بھی چلیں۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے رحم و عدل کے جو حدود شریعت نے باندھے ہیں مثلاً ضعیفوں بوڑھوں، نہتوں، عورتوں، راہبوں مذہبی عبادتگاہوں وغیرہ سے تعارض نہ کرنا ان سے قدم باہر نہ نکالیں۔ پھر اس حکم کی علت بھی بتلادی کہ "اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ. (۲:۱۹۱) بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے لیکن اس برائی سے بھی بڑھ کر برائی یہ ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قانع نہیں رہتے، دوسروں کے حقوق آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں اور توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں۔ قوموں کا قدرتی حق حریت پامال کررہے ہیں۔ اگر اس کے دفاع کا انتظام نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ و باقی نہیں رہ سکتی۔ پس بڑی برائی کے دور کرنے کے لیے چھوٹی برائی اختیار کرلینی چاہیے یہ خود نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا دائمی عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

سورہ محمدؐ میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بھی بتلادی ہے۔

"حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا" (۴۷:۴) لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہوجائے۔

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح وامن قائم ہو جائے۔ ساری دنیا ایک قوم، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کریں لیکن جب تک جنگ کرنے والی ظالم وحریص قوتیں باقی ہیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس پہلے مفسد وجابر قوتوں کا مقابلہ کرنا اور ان کو فنا کر دینا ضروری ہوا۔ مضبوط اور مستقل امن اسی وقت قائم ہوگا جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے:

"حَتّٰی اِذَآ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ" (۴:۴۷) یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا، مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہوگا۔

"وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ" (۲:۱۷۹) تمہارے لیے قصاص کی موت میں امن کی زندگی پوشیدہ ہے۔

لہٰذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور بواعث جنگ سے باز نہ آجائے جنگ کرتے رہو، کبھی اس سے نہ جھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں جنگ کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے۔'' **تضع الحرب اوزاره**" جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد وبطلان کی وہ قوتیں ہی باقی نہ رہیں جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے رنگتی رہتی ہیں۔۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر ضرور آئے گا، مگر اسی وقت آئے گا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن واخوت کے آگے جھک جائے گی:"هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ" (۹:۳۳)۔
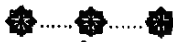
حواشی

ا روی الحاکم من حدیث الاعمش عن ابن عباس قال لما خرج رسول الله صلی اللّٰہ علیہ وسلم من مکة قال ابوبکر اخرجوا بینهم انا لله وانا الیه راجعون لیهلکن فانزل اللّٰہ اذن للذین یقاتلون الخ وهی اول آیة نزلت فی القتال اسناده علی شرط الصحیحین

۲ یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک قسم قتال ہے پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں دفاع اور ہجوم۔ ان آیات میں دفاع کا حکم ہے۔ ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے اور اس کے مواقع وبواعث اور شرائط دوسرے ہیں۔

فضائلِ دفاع

اسلامی احکام میں حکم "دفاع" جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن وحدیث میں بار بار یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قومی زندگی اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا، اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہ آ سکے گی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب تک یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت وعزت انہی کے لیے تھی اور جب چند گھڑیوں کے عیش وراحت کا عشق قومی زندگی وعزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آ گیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت ومحکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار وذلیل ہو کر رہ گئے:

"ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ".(۲:۶۱)

"اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ" (۲-۲۴۶)

کیا تم بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد کیا ہوا؟ پہلے تو خود ہی اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی "کسی کو ہم پر بادشاہ بنا دو کہ اس کے ماتحت اللہ کی راہ میں لڑیں" نبی نے کہا "اگرچہ تم ایسا کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے اترو۔ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو بزدلی دکھلا کے نافرمانی کر جاؤ گے" ان لوگوں نے جواب دیا "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہم کیوں نہ حق کی راہ میں ظالموں سے جنگ کریں گے حالانکہ انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے شہروں سے نکال دیا ہے" لیکن دیکھو جب لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول واقرار سے پھر گئے۔ وقت پر ان کا دعویٰ سچا ثابت نہ ہوا۔

سنن ابوداؤد میں ہے۔ اذاضن الناس بالدینار والدرهم وتبایعوا بالعین واتبعوا

اذناب بقر، وترکوا الجهاد فی سبیل الله، انزل الله بهم بلاء فلم یرفعه حتی یراجعوا" یعنی جب کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دور نہیں ہوسکتیں الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں۔

چونکہ شریعت وملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی تھی اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کرسکتا ہے اس عمل کا مرتبہ واجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار وقربانی ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر وثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال وجان کا ایثار ہوسکتا ہے۔

کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں، ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مسلم ومومن زندگی کے ایمان وصداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق وولولہ ہے، یہی سنام دین ہے، یہی عماد ملت ہے، یہی اساس شرع ہے، یہی املاک اسلام ہے، یہی ایمان ونفاق کی اصلی کسوٹی ہے، یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصلی پہچان ہے۔ نماز اسی سے ہے، روزہ اسی سے ہے، حج اسی سے ہے۔ زکوۃ کا سب سے پہلا اور افضل مصرف یہی ہے سب اس کے لیے ملتوی ہوجا سکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے ک لیے ڈھال لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کر دینے والی تلوار۔ پس اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ، نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے۔ ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرہ خون کی فضیلت وتقدیس نہیں پاسکتے جو اس راہ میں بہایا گیا اور عمر بھر کی صدقات وخیرات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ حتی کہ یہی عمل اسلام وایمان کی اصلی پہچان قرار پایا۔ جس مسلمان کا دل اس کے ولولہ وطلب سے خالی ہوا وہ ایمان واسلام کی روشنی سے محروم ہوگیا۔ نفاق کی ظلمت اس پر چھا گئی۔ صحیح مسلم میں ہے۔

"من مات ولم یغزو ولم یحدث نفسه به، مات علی شعبة من النفاق (عن ابی هریرة)" جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی اور نہ اس کے دل میں اس بات کی طلب رہی، اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قرطبی نے اس کی شرح میں کہا۔ "فیه دلیل علی وجوب العزم" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہوگیا تو

وہ مومن نہیں منافق ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان چاہیں تو اس فرمان رسول کو سامنے رکھ کر اپنے ایمان و نفاق کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا۔ ای الاعمال احب الی اللہ" ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے؟ اس پر سورہ صف نازل ہوئی!

"اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِه صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ" (۶۱ : ۴) اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماؤ سے لڑتے ہیں گویا ایک مضبوط دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے اور دیوار بھی کیسی! ایسی کہ جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو!

پھر اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا: یہی وہ عمل ہے جس کے کرنے کے بعد تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، کوئی خطا، کوئی معصیت، کوئی برائی باقی نہیں رہتی، ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھل جاتا ہے۔

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِه وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۰ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" (۶۱ : ۱۰ - ۱۲)

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا۔ "ای العمل افضل"؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا "ایمان باللہ و رسولہ" اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا "ثم ماذا"؟ اس کے بعد؟ فرمایا "الجهاد فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جہاد!

بخاری میں ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے "قیل ای الناس افضل؟ فقال مومن یجاهد فی سبیل اللہ بنفسه وماله" آپ سے پوچھا گیا۔ سب سے زیادہ افضل آدمی کون ہے؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے۔

اور فرمایا۔ "لغدوة فی سبیل اللہ اور روحة خیر من الدنیا وما فیها اور خیر مما تطلع علیه الشمس وتغرب" (بخاری) جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔

بخاری میں دو حدیثیں ہیں (۱) "مامن عبد یموت له عندالله خیر یسره ان یرجع الی الدنیا وان له الدنیا ومافیها الا الشهید".

(۲) "لما یری من فضل الشهادة فانه یسره ان یرجع الی الدنیا فیقتل مرة اخری" اور روایت انس مااحدیدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامة".

حاصل دونوں کا یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی مگر اس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ جب وہ شہادت کا اجر و ثواب دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے کاش پھر دنیا میں جا سکوں اور دس مرتبہ اسی طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور ہر مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل کروں۔

حد ہوگئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جاں نثاریاں کی تھیں، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تو آپ ﷺ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا لعل الله اطلع علی اهل بدر فقال اعملوا ماشئتم یہ وہ جان نثار ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو جی میں آئے کرو!

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے اور کہ جب شام کے رومیوں کی تیاریوں کی خبر پہنچی تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے اور دو سو اوقیہ سونا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لایضر عثمان ماعمل بعدها" آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ "(اخرجه الترمذی والحاکم ایضاً من حدیث عبدالرحمن بن حباب نحوه".

سبحان اللہ! اس عمل عظیم کی برکت و بخشش! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل و فاع کے لیے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسول کی نظروں میں ایسا محبوب و محترم کام ہے، جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کسی عمل کسی طاعت، کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نہ ہوئی۔

ترمذی میں ہے "من رابط لیلة فی سبیل الله کانت له کالف لیله صیامها وقیامها" جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی، اس کے لیے ایسا

اجر ہے گویا ہزار دنوں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت۔

اور فرمایا: "مقام احدکم فی سبیل اللہ خیر من عبادۃ احدکم فی اہلہ ستین سنۃ" (ترمذی) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ۔

اور فرمایا "حرس لیلہ فی سبیل اللہ، افضل لہ من الف لیلۃ، یقام لیلھا ویصام نھارھا" (رواہ احمد) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں۔

اور فرمایا "حرمت النار عین دمعت من خشیۃ اللہ وحرمت النار علی عین سھرت فی سبیل اللہ" (ایضاً) جو آنکھ اللہ کے خوف سے اشکبار ہوئی، یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔

ایک شخص نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو۔ فرمایا۔ "ھل یستطیع ان تصلی فلاتفتر، وتصوم فلاتفطر؟ اس کی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قضا نہ ہو برابر روزہ رکھتے رہو اور کبھی بیچ میں افطار نہ کرو؟ عرض کیا "انا اضعف من ان استطیع ذالک" یہ تو میری طاقت سے باہر ہے، فرمایا "والذی نفسی بیدہ! لوطوقت ذلک، مابلغت فضل المجاھدین فی سبیل اللہ اماعلمت ان فرس المجاھد لیستن فی طولہ لیکتب لہ بذالک الحسنات" خدا کی قسم! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے، جب بھی ان لوگوں کی فضیلت کہاں پاسکتے تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے نامہ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں؟ (رواہ احمد وایضاً رواہ البخاری باختلاف یسیر)

بخاری و مسلم میں ہے۔ تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا۔ مایعدل الجھاد فی سبیل اللہ؟ کونسا کام ہے جو جہاد کے برابر درجہ و فضیلت رکھتا ہو؟ تین مرتبہ فرمایا۔ "لاتستطیعو لہ" "تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو جہاد کے برابر درجہ رکھتا ہو اور تم کرسکو، پھر فرمایا " مثل المجاھد کمثل الصائم القائم القانت بایات اللہ لایفتر عن صلاتہ ولاصیامہ حتی یرجع۔

اور فرمایا۔ "من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ ساعت من نھار فھما حرام علی النار" (رواہ احمد) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کے لیے بھی گرد آلود ہوئے، دوزخ کی

آگ ان قدموں پر حرام ہے۔

امام بخاری نے اسی حدیث کو یوں روایت کیا ہے۔"ما اغبرت (وفی روایۃ المستملی "اغبرتا" (بالتثنیہ) قدما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار." ایسا نہیں ہوسکتا کہ جس بندے کے پاؤں جہاد کی راہ میں غبار آلود ہوئے ہوں، ان کو جہنم کی آگ بھی چھو سکے۔ حافظ عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔اس حدیث سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت وفضیلت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب صرف غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ ان پر حرام ہوجاتی ہے تو جو خوش نصیب جہاد ودفاع میں کمال سعی وتدبیر کرے اور اپنی جان اور مال کو اس کے لیے وقف کردے اس کے اجر وثواب کا کیا حال ہوگا؟ اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔"فاللہ یضاعف لمن یشاء".

اور فرمایا مامن میت یموت الاختم عملہ، الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ فانہ نیمولہ عملہ الی یوم القیمۃ وامن من فتنۃ القبر" رواہ اصحاب السنن) کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہوجاتا ہو، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا سو اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔

یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے۔ حسنات جاریہ بموجب نص حدیث مسلم تین ہیں اولاد صالح، علم نافع، اوقاف وتعمیرات خیریہ۔ مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو باقی رہیں۔ اس حدیث اور اس کی ہم معنی احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ علت اس کی بالکل واضح ہے۔ عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کے لیے اپنا وجود قربان کردیا جائے۔ پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ بچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہو اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی وقتی نہ ہو، دائمی ہو۔ عمل کا اجر تو نتائج پر موقوف ہے جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملیں گے تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہوجائے۔

اس حدیث میں "مرابطا فی سبیل اللہ" کا لفظ آیا ہے اور دوسری حدیثوں میں بھی جابجا "رباط" کا لفظ وارد ہے۔ "رباط" سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں ٹھہر کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا تاکہ جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے۔ نہایہ میں ہے۔"ھو الاقامۃ فی مکان یتوقع ھجوم العدو فیھا لقصد دفعہ للہ" پس مرابطا فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لڑ کر شہید ہونے کا موقع نہیں ملا اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی، جب بھی اس کا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہے گا اور وہ ہزاروں کے روزہ و نماز سے بھی افضل ہے اسی بنا پر امام بخاری وامام نووی وغیرہما نے فضل الرباط

فی سبیل اللہ کا باب باندھا ہے۔

قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۰ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۰ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۰ (۹:۲۰-۲۲)

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے جہاد کیا سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اور اونچا درجہ انہی کا ہے یہی لوگ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے اللہ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے۔ اس کی رحمت، اس کی محبت، بہشتی زندگی کی نعمتیں اور ان کی دائمی ورہیشگی۔ سب کچھ ان ہی کے لیے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و دفاع میں حصہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں یا اور کسی طرح کی خدمت انجام دیں تو اگر چہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں اور طاقتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔

ابن ماجہ میں ہے "من رسل بنفقة فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ، فلہ بکل درھم سبع مائة درھم ومن غزا بنفسہ سبیل اللہ وانفق فی وجھہ ذالک، فلہ لکل درھم سبع مائة الف درھم، ثم تلاھذہ الایة." وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ"

یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے روپیہ سے جہاد میں مدد دی تو اس کو ہر ایک روپیہ کے بدلے سات سو روپیوں کا اجر ملے گا یعنی اس انفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے اور جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک کار رہا تو اس کے لیے سات ہزار درجہ زیادہ اجر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ "اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے۔

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے۔"فضل من جھز غازیا اس میں زید بن خالد کی حدیث لائے ہیں۔ من جھز غازیا فی سبیل اللہ فقد غزا ومن خلف غازیا فی سبیل اللہ بخیر فقد غزا۔"یعنی جس شخص نے مجاہد و غازی کے سامان کا انتظام کر دیا تو گویا اس نے خود جہاد کیا اور جس نے اس کے پیچھے اس کے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اس کے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے!

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے، معلوم ہے، علی الخصوص والدین اور اقربا کے کے حقوق کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے جس کے لیے یہ حقوق بھی روک نہیں ہو سکتے۔ امت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت

موقوف ہے پس اگر امت دشمنوں کے نرغہ میں ہے تو نیکی کا سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔اب اس بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، رشتے ناتے اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں سب کا حق ادا کرنا چاہیے لیکن خدا اور اس کی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے۔اس رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں پس اگر اس کے کام کا وقت آ گیا تو سب کو اس کی خاطر چھوڑ دینا پڑے گا۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۹:۲۴)

مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے والدین تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور اس کے تمام رشتے، یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے یہ کاروبار تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، یہ تمہارے رہنے کے محل جن میں تمہارا دل اٹکا ہوا ہے اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں اور تمہارے پاؤں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی انہیں نہیں ہلا سکتی، تو جان لو کہ اللہ کا کام بھی تمہارا احتاج نہیں۔نتائج کا انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا منظور ہے کر دکھائے۔اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا!

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اس وقت لازم سے الزم ہو جاتی ہے جب حملہ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آ جائے لیکن عزم و استقلال کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کے لیے تیار رہیں اور تیاری کرتے رہیں۔اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ جو دل اس کے عزم وطلب سے خالی ہوا، اس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ (۸:۶۰)

جس قدر بھی تم سے ممکن ہو، دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنی قوت اور ساز و سامان سے تیار رہو تا کہ تمہاری مستعدی دیکھ کر اللہ اور اس امت کے دشمنوں پر خوف اور رعب چھا جائے تم پر حملہ کرنے کی جرات ہی نہ ہو۔

❁.....❁.....❁

حواشی

ا۔ واخرجه ایضا امام احمد عن عبدالله بن سلام وابن ابی حاتم وابن حبان والحاکم وقال صحیح علی شرط الصحیحین، والبیهقی فی شعب الایمان والسنن والطبری فی التفسیر،

عہدِ نبوّت کا ایک واقعہ

یہ قرآن وسنت کے احکام ہیں۔ اب دیکھیں صاحب شریعت کا اس بارے میں طرز عمل کیا رہا ہے۔

ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے۔ یہ سن کر آپ نے بھی تیاری کا حکم دے دیا اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا۔ چونکہ یہ فوج بڑی ہی تنگدستی اور بے سروسامانی کے حال میں نکلی تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آئی تھی۔ جنگل کے پتے کھا کر لوگوں نے گزارہ کیا تھا، اس لیے اس فوج کا نام "جیش العسرۃ" مشہور ہوا۔ اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (۹:۱۱۷)

آج تم خدا اور اس کے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان واسلحہ کی پرستش کر رہے ہو۔ لیکن ایک وقت وہ بھی تھا، جب بے سروسامان مسلمانوں کی یہ جماعت نکلی تھی، تا کہ کرہ ارض کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی رومیوں سے مقابلہ کرے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اسی دفاع کے لیے اپنا تمام مال ومتاع پیش کر دیا۔ جب ان سے پوچھا گیا "ماابقیت لاھلک" اپنے بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو اس پیکر ایمان ومجسم عشق حق نے جواب دیا تھا۔ "ابقیت لھم اللہ ورسولہ" اللہ اور اس کے رسول کو۔

آنکس کہ ترا بخواست، جاں را چہ کند
فرزند وعیال وخانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

تبوک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دلیرانہ تیاریوں کا حال سن کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر ہو گئیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔

اس دفاع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے۔ صرف تین شخص نہ جا سکے۔ کعب بن مالکؓ۔ ہلال بن امیہؓ۔ مرارہ بن ربیعؓ۔ کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں اور ان

۳۷ سابقین مخلصین میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کے ایمان واخلاص میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ ان کا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا سستی اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقع نکل گیا۔

بایں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظروں میں اس درجہ اہم ہے کہ اتنی سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی۔ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور فیصلہ وحی کا انتظار کرو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات ان سے ترک کردیں۔ نہ کوئی بات چیت کرے نہ ملے جلے نہ اور کسی طرح کا واسطہ رکھے۔ پھر ان کی بیبیوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ امام بخاری نے ایک طویل روایت خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کے لیے خاص باب باندھا ہے۔ کعبؓ کہتے ہیں ہمارا یہ حال ہوگیا تھا کہ سارا مدینہ انسانوں سے بھرا تھا مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک زبان بات کرنے والی۔ خود عزیز وا قارب نے ملنا جلنا ترک کردیا تھا۔ حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔ ایک دن اپنے چچیرے بھائی ابوقتادہؓ کے یہاں گیا مجھے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ سلام کیا تو جواب نہ ملا۔

اللہ اللہ! کیا مسلمان تھے کہ ان کا رشتہ تھا تو اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ، زندگی تھی تو صرف اس کی حکم پر الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے۔

غسان کے عیسائی بادشاہ نے یہ حال سنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا اچھا موقع نکل آیا ہے۔ کعبؓ کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر بھیجا کہ تمہارے آقا ﷺ نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا جو معاوضہ دیا ہے وہ دیکھ چکے ہو۔ اب میرے پاس چلے آؤ۔ دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے؟ کعب بن مالکؓ کو خط ملا تو ایلچی کے سامنے آگ میں جھونک دیا اور کہا جواب میں کہہ دینا ہم نے جس آقا ﷺ کی چوکھٹ پر سر رکھا ہے اس کی گہرائیوں اور دلربائیوں کا حال تمہیں کیا معلوم! اس کی بےالتفاتی بھی دوسروں کی محبت وعزت سے ہزار درجہ زیادہ عزیز ومحبوب ہے:

اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی۔ بالآخر اللہ تعالےٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۹:۱۱۸)

اور وہ تین آدمی جن کا معاملہ فیصلہ الٰہی کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا سو جب ان کا یہ حال ہوا کہ تمام مسلمانوں نے ان کو چھوڑ دیا، زمین باوجود اپنی وسعت کے ان پر تنگ ہوگئی۔ اپنی زندگی سے بیزار ہوگئے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف تو پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا اور خطا کاروں کے لیے مہربانی رکھتا ہے۔

حضرت کعبؓ کو جب قبولیت توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور پنا سارا مال ومتاع شکرانہ قبولیت میں لٹا دینا چاہا۔

اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں:

(۱) رومیوں نے حملے کی تیاریاں کیں تو اسلام و امت کی حفاظت کے لیے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہوگیا۔ موسم سخت گرمی کا تھا۔ سفر دور دراز کا بے سروسامانی حد درجہ کی۔ مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دنیا پر حکمران تھی۔ حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اصلی وقت تھا۔ یہی فصل ملک کے لیے سال بھر کی خوراک تھی۔ اگر مشکلوں اور مجبوریوں کے عذر سنے جاسکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھ کر اور کون سے حالات عذرداری کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سنا گیا، نہ کوئی مشکل رکاوٹ ہوسکی۔ حکم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ دو ساری مصیبتیں جھیل لو۔ مگر دشمنوں کو روکنے کے لیے نکل کھڑے ہو۔ سورہ توبہ میں اس کا بڑا ہی عبرت انگیز تذکرہ ہے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

قَالُوْا لَاتَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ۝ (۸۱.۹)

(۲) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے، مومنین مخلصین میں سے تھے ان کی زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جاں نثاریوں میں بسر ہوئی تھیں عبادتوں اور نیکیوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایہ تربیت میں رہتے تھے، ان ہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کر کے بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت کعب بن مالکؓ سابقون الأولون میں سے تھے۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں جن ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا۔ ہر جنگ میں شرکت کی، ہر موقع پر جان و مال نثار کیا۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے، تو دل کی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں، چلنے کا پورا سامان کر لیا تھا۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا۔ تاہم دیکھو یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسا بڑا جرم قرار پائی کہ نہ تو کوئی پچھلی خدمت آڑے آسکی، نہ مدت العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے

کچھ کام دیا۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیع ہو سکی، نہ ایک ایسے پکے اور پرکھے ہوئے مخلص مسلمان کے لیے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی۔ سخت سے سخت سزا جو دی جا سکتی تھی دی گئی اور مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ توڑ دیا گیا۔ پچاس دنوں کے لیے جماعت سے باہر کر دیے گئے یہ سارا زمانہ گریہ وزاری اور عبادت واستغفار میں بسر ہوا تب کہیں جا کر توبہ قبول کی گئی۔

(۳) اسلام کے احکام کا قبولیت توبہ کے بارے میں جو حال ہے معلوم ہے خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا جس قدر اس مضطرب روح کا، جو توبہ کے لیے اس کی طرف بڑھے، **لو اخطاتم حتی تملاء خطایاکم مابین السمآء والارض ثم استغفرتم اللہ یغفر لکم**" (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃؓ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کے درمیان وسعت ان سے بھر دی جا سکے، پھر بھی توبہ کے آنسو بہاتے ہوئے آؤ تو دروازہ مغفرت کھلا پاؤ گے لیکن دیکھو، امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکا یک توبہ بھی قبول نہ ہوئی۔ تینوں صحابی آپ کی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عفو تقصیر کے لیے حاضر ہو گئے تھے، مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں انتظار کرو۔ پچاس دن سزا و عقوبت کے گزر چکے تب کہیں جا کر توبہ قبول ہوئی۔

(۴) جب ان پاک اور مخلص انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان ان کا ایمان تھا اور نیکیاں ان کی نیکیاں، ان کے بستر پر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں تو خدارا بتلاؤ، ہم بدبختوں اور سیاہ کاروں کا کیا حشر ہوگا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ طاعت و حسنات کی پونجی دامن میں۔ زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت اور عمریں یک قلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی۔ وہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہو و نسیان تھا مگر عذر قبول نہ ہوا۔ یہاں اغراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ ندامت ہے نہ توبہ و انابت ان کے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بے خوفی کی موت چھا گئی ہے۔ بتلاؤ زمین و آسمان میں کون ہے جو اس دن ہمیں بچا سکے گا، جب خدا کے غضب کا بے پناہ ہاتھ ہماری طرف بڑھے گا! **یقول الانسان یومئذ این المفر؟**

❁......❁......❁

ایک عام غلط فہمی

البتہ یادرہے کہ "جہاد" کی حقیقت کی نسبت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں۔ مخالفین اسلام بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان ومقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دینا ہے:

"جہاد" کے معنی: کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ کی سعی وکوشش کو جو ذاتی اغراض کی جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے "جہاد" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہوتی ہے، مال سے بھی، انفاق وقت وعمر سے بھی۔ محنت وتکالیف برداشت کرنے سے بھی اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی۔ جس سعی کی ضرورت ہو اور جو سعی جس کے امکان میں ہو وہ اس پر فرض ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغت وشرع، دونوں اعتبار سے یہ بات داخل نہیں ہے کہ "جہاد" سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی ولسانی پر نہ ہوتا۔ حالانکہ کتاب وسنت ایسے اطلاقات سے لبریز ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحبِ اقناع نے نقل کیا ہے جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل وجامع ہے۔ "الامر بالجهاد منه مايكون بالقلب، كالعزم عليه، ومنه مايكون باللسان كالدعوة الى الاسلام والحجة والبيان والرائے والتدبير فى ما فيه نفع المسلمين وبالبدن اى القتال بنفسه فيجب الجهاد بغاية مايمكن من هذه الامور (جلد۱:۶۵۳)

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی ہر صبح وشام جہاد حق میں بسر کرتا ہے۔ مشہور حدیث ہے۔ "المجاهد من جاهد نفسه فى ذات الله والمهاجر من هجر مانهى الله عنه"

سورہ فرقان میں ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵:۵۲) یعنی کفار کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا جہاد کرو۔ سورہ فرقان بالاتفاق مکی ہے اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور کرنا چاہیے کہ مکی زندگی میں کونسا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا یقینا وہ حق پر استقامت اور اس کی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا

جہاد تھا۔ کی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا، سب کو معلوم ہے حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی، جیسی اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں نے کی زندگی میں برداشت کیں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (۷۳:۹) حالانکہ منافق تو خود اسلام کے ماتحت مقہورانہ ومحکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے، ان سے جنگ وقتال کی ضرورت نہ تھی مگر ان سے بھی جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق واتمام حجت کا جہاد تھا جو قلب وزبان سے تعلق رکھتا ہے۔

بخاری وابن ماجہ میں ہے حضرت عائشہؓ نے پوچھا "علی النساء جهاد" کیا عورتوں کے لیے بھی جہاد ہے؟ فرمایا "نعم جهاد، لاقتال فيه. الحج والعمرة" ہاں جہاد ہے مگر اس میں لڑنا نہیں ہے حج اور عمرہ۔ اس حدیث میں اس سعی اور ترک وطن کی محبت کو جو حج وعمرہ میں پیش آتی ہے عورتوں کے لیے جہاد فرمایا اور کہا ایسا جہاد جس میں لڑائی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت "جہاد" باقی رہتی ہے۔

اگر امت کے لیے دفاع وجنگ کا وقت آ گیا یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی وکوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں۔ جس کی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے جس نے زبان سے دعوت وتبلیغ کی وہ بھی مجاہد ہے جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی تکلیف ومحنت اٹھائی، وہ بھی مجاہد ہے۔ البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلوتہی کرے تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ اس کا شمار مومنوں کی بجائے منافقوں میں ہوگا۔ جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا تو وہ بھی ایمان واخلاص کی زندگی سے نکل گیا زمین پر گو مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور منافق کہلائے گا۔ جس شخص کی زبان اعلان حق کے لیے جہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی، اس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ گو شیطان حیل اور نفس خادع اس کو ہزار فریب دیتا ہے ترمذی اور ابوداؤد میں ہے "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمہ حق ہے جو شاہان جور وظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے۔

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ ان مجاہدین کاملین اور اصحاب عزیمت وعمل کا ہے جن کی زندگی سرتاسر جہاد فی سبیل اللہ، اور جن کا وجود یکسر خدمت حق وشیفتگی صدق، وعشق دعوت ہے، جو اس عمل مقدس کے لیے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے۔ بلکہ ہر صبح جوان پر آتی ہے،

جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے اور ہر شام کی تاریکی جوان پر پھیلتی ہے، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے ان کی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا وفضیلت عظمٰی کے اجر وثواب سے خالی ہو۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے: دل، زبان، اعضاؤ جوارح۔ سو ان کا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے ان کی زبان ہمیشہ اعلان حق ودعوت الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے۔ ان کے ہاتھ اور ان کے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی ومحنت سے نہیں تھکتے۔ اس کے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا؟ اس راہ کا کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا: "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" (۵۷:۲۱)

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا　　　ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو! انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی اور نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اس کے بغیر انجام پا سکتا ہے پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کی اہمیت وفضیلت پر اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں، ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا جڑ یہی عمل قرار پایا اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت کی ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ، لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم اقتل. ثم احیا، ثم اقتل"(رواہ البخاری)

خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں تا کہ اس کی راہ میں جان دینے کی سعادت ولذت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

تمنتی سلیمی ان نموت بحبها
واهون شئی عندنا ما تمنت

❁……❁……❁

احکام قطعیہ دفاع

غرضیکہ "دفاع" اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے، جن کو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کرسکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سنے اور از سرتاپا کانپ نہ اٹھے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ (۹:۳۸)۔

مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہوتو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت چھوڑ کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت کرلی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو جس زندگی پر ریجھے بیٹھے ہو وہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْئًا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۹:۳۹)

یاد رکھو اگر تم نے حکم الٰہی سے سرتابی کی اور وقت کے آنے پر بھی راہ حق میں کمربستہ نہ ہوئے تو اللہ نہایت ہی سخت عذاب میں ڈال کر اس کی سزا دے گا۔ اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کے لیے کھڑا کردے گا اور تم چھانٹ دیے جاؤ گے۔ کلمۂ حق تمہارا احتاج نہیں ہے تم ہی اپنی زندگی ونجات کے لیے اس کے محتاج ہو!

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت! ان کی حکومتوں کے مٹانے اور ان کی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کے لیے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں:

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ (۸:۷۳)

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر ڈالتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۸:۳۶)

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی وایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹:۷۱)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم ایک دوسرے کی رفیق اور مددگار ہیں۔

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض ٹھہرا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان ان کے مقابلہ کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کی یاوری و اعانت کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اٹھتے اور اپنی جان و مال سے اسی طرح مدد دیں جس طرح خود اپنے گھر بار کی حفاظت کے لیے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں اور جن پر خود ہندوستانی عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ ان سب میں یہ احکام موجود ہیں۔ اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملے گا جو ان حکموں سے بے خبر ہو اور پھر ان سب کے اوپر کتاب اللہ (قرآن) ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکیں اور یہ احکام اپنی یکساں، غیر متبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

''جہاد'' کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم ''قتال'' یعنی لڑائی ہے اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ''ہجوم'' اور ''دفاع'' یعنی آفینسو (OFFENSIVE) اور ڈیفنسو (DEFENSIVE) دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے ضروری ہے کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہوں گے۔

فقہا کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں ''کفایہ'' اور ''عین''۔ یہ وہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جس کو ''جماعتی فرائض'' اور ''شخصی فرائض'' کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ''فرض کفایہ'' سے مقصود وہ احکام ہیں جو بہ حیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بہ حیثیت فرد و افراد۔ یعنی اپنے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے ہیں کہ ان کا انتظام

کردیں۔ پس انتظام ہوجانا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بذات خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں پر سے اس وقت ساقط ہوگیا جیسے تجہیز و تکفین اموات اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کے لیے عزیمت اسی میں ہوگی کہ ادائے فرض کفایہ میں بھی حصہ لے۔

فرائض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں ہے بلکہ جماعت سے ہے۔ پس ہر مسلمان جماعت اور آبادی کو اس کا انتظام کردینا چاہیے جب انتظام ہوگیا تو اس آبادی کے بقیہ افراد پر اس کا وجوب باقی نہ رہے گا۔

دوسری قسم ''اعیان'' کی ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوجاسکتا جیسے پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے۔ بحکم'' **وما كان المومنون لينفروا كافته** ''ضروری نہیں کہ بہ یک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے جو مسلمان شریک ہوگا اس کے لیے بڑا اجر ہے جو شریک نہ ہوگا اس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ صاحب ہدایہ (جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ اور ہندوستانی عدالتوں میں محمڈن لاء کی بنیادی کتاب ہے) لکھتے ہیں۔

الجهاد فرض على الكفايه اذا قام فريق من الناس سقط عن الباقين. فان لم يقم به احد، الم جميع الناش بتركه. لان الوجوب على الكل (کتاب السیر ا)

جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں کی کوئی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی تو باقی مسلمانوں کے لیے واجب نہیں رہا لیکن اگر کوئی گروہ بھی اس کے لیے نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کردینے کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے، کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے۔

لیکن جماعت سے کیا مقصود ہے! تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت یا ہر ہر ملک اور اقلیم کی جماعت؟ اس کی تشریح سعدی چلپی حاشیہ عنایہ میں کرتے ہیں:

> **اقول لا ينبغى ان يفهم منه ان الوجوب على جميع اهل الارض كافه حتى يسقط عن اهل الهند بقيام اهل الروم اذلا يندفع بقيامهم الشرعن الهنود. المسلمين وان قوله تعالى قاتلوا الذين**

یلونکم من الکفار یدل علی ان الوجوب علی اھل کل قطر یقربن الکفار. (مجموعہ فتح القدیر ۴:۔۲۸)

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا۔ مثلاً اگر روم کے ترکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا۔ کیونکہ مقصود قیامِ جہاد سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر سے دشمنوں کے حملوں اور شر کو دور کیا جائے ظاہر ہے کہ مسلمانانِ روم کے جہاد کرنے سے مسلمانانِ ہند محفوظ نہیں ہو جا سکتے۔ وہ تو تب ہی محفوظ ہوں گے جب خود اپنے ملک میں اس کا انتظام کریں۔ پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی تو وہاں کے بقیہ مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہے گی۔ قرآن میں ہے: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ۔(۹:۱۲۳) اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں قتال واجب ہے۔ انتہا

اس سے واضح ہو گیا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانان عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ملک کے مسلمانوں سے ہے اور علی الکفایہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ مسلمان اس فرض کو انجام دیتے رہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے۔ کہ حصول مقصد جہاد کے لیے کافی ہو۔ پس ایک ملک میں سلسلہ جہاد کے بقاء سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ان پر بدستور اس کا وجوب باقی رہے گا اور بصورت ترک اس ملک کے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔ گزشتہ پانچ صدیوں سے مسلمانان عالم نے اس فرض شرعی کو یک قلم فراموش کر دیا ہے اور صرف کسی ایک حصہ کے مسلمانوں ہی کے ذمہ اس کو چھوڑ کر خود فارغ البال ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعدائے حق کو صدیوں کی صدیاں عروج وظہور کے لیے مل گئیں، اور مسلمانوں کے لیے تمام کرۂ ارضی میں ایک گوشہ بھی امن وسکون کا باقی نہ رہا۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۰ (۹:۷۰)

اور فتح الباری میں ہے ”ھو فرض کفایه علی المشھود، الا ان تدعو الحاجة الیه“ اس کے بعد کہا ”وان جنس جهاد الکفار متعین علی کل مسلم، اما بیده، و اما

بلسانه و اما بما له و اما بقلبه" (جلد۶: ۲۸) یعنی جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے۔ باقی رہا نفس جہاد تو وہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ کسی کے لیے ہاتھ سے، کسی کے لیے مال سے، کسی کے لیے دل سے۔ یعنی جس وقت ایک گروہ ہاتھ اور تلوار سے معروف جہاد ہوگا تو بقیہ مسلمانوں پر دل اور زبان سے ان کی سعی و اعانت فرض ہوگی اور مال و دولت والوں کا فرض ہوگا کہ مال سے مدد کریں۔

اسی طرح اقناع میں ہے۔"هو فرض كفايه اذا قام به من يكفي سقط وجوبه عن غيرهم" ابن ادریس اس کی شرح میں لکھتے ہیں و معنى الكفايه في الجهاد ان ينهض اليه قوم يكفون في جهادهم اما ان يكونوا جنداً الهم دواوين او يكونوا اعدوا انفسهم له تبرعاً و تكون في الثغور من يدفع العد و عنها و يبعث في كل سنّت جيشا يغيرون على العد و في بلادهم" (جلد ا۔ ۶۵۱)

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ وہجوم کی ہوگی۔ دوسری قسم "دفاع" ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کا قصد کرے تو اس حملہ وتسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کر کے روکنا اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح قبضہ واثر سے محفوظ رکھنا۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہوجاسکتے۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے نماز ساقط نہیں ہوجاتی۔ اسی "ہدایہ" میں ہے۔

"الا ان يكون النفير عاماً فحينئذ يصير من فروض الاعيان"

نفیر "نفر" سے ہے "نفر" کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو "نفیر" کا اطلاق ہوا۔ قرآن میں ہے۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (۹: ۴۱) اور اِلَّا تَنْفِرُوْا ۔(۹: ۳۹) مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ ودفاع کی ضرورت سے عام اجتماع وقیام کا وقت آ گیا تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہوجاتا ہے۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

هذا اذا لم يكن النفير عاما فاذا كان النفير عاما بان هجموا على بلدة من بلاد المسلمين فيصير من فروض الاعيان سواء كان المستنفر عدلا اوفا سقا.

(فتح القدیر ۴: ۲۸۰)

فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو لیکن اگر مسلمانوں کے شہروں

میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے گا۔ خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق۔

اور عنایہ میں ہے:

''ثم الجهاد يصير فرض عين عندالنفير العام على من يقرب من العدو وهو يقدر عليه'' (مجموعہ فتح القدیر ۴:۲۸۱)۔

اور اگر نفیر عام کی حالت ہو تو پھر جہاد کرنا ان سب مسلمانوں پر فرض عین ہو جائے گا جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قدرت رکھتے ہوں۔

اسی طرح سراجیہ، درالمختار اور شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے۔

''اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو اور الجهاد فرض كفايه اذا لم يكن النفير عاما فاذا اقام به البعض يسقط عن الباقين، فاذا صار النفير عاماً، فحينئذ يصير من فروض الاعيان'' الخ

حملہ و ہجوم کے دائمی جہاد میں (جب قتال فرض کفایہ ہوتا ہے)۔ بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں مثلاً عورتیں اور نوکر عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کے لیے آقا کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آ گئی ہو تو اس کی فرضیت ایسی ہمہ گیر اور بالاتر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ، کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو۔ غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول جہاد ہو جائے۔ ہدایہ میں ہے:

''فان هجم العدو على بلد وجب على جميع الناس الدفع تخرج المراة بغير اذن زوجها والعبد بغير اذن المولى لانه صار فرض عين، وملك اليمين ورق النكاح لا يظهر فى حق فروض الاعيان كما فى الصلوٰة والصوم بخلاف ماقبل النفير لان بغير هما مقنعاً فلا ضرورة الى ابطال حق المولى والزوج (کتاب السیر)

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا، تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہو گیا بیوی بلا شوہر کی اجازت کے اور غلام بلا آقا کی اذن کے دفاع میں حصہ لے اس لیے کہ اب جہاد فرض عین ہو گیا اور جو فرائض ایسے ہیں ان پر ملکیت اور زوجیت کے حقوق موثر نہیں ہو سکتے جیسے نماز اور روزہ۔ اگر نماز کا وقت آ گیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہو گئی شوہر کے اذن پر موقوف نہیں۔ البتہ نفیر سے پہلے یہ صورت نہ تھی۔ اس وقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہو سکتا تھا۔ پس ضرورت نہ تھی کہ شوہر اور آقا کے حقوق باطل کیے جائیں۔

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اس لیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں اور انگریزی میں محمڈن لاء پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں سب میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ پس بآسانی دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے شرعی احکام یہی ہیں یا نہیں؟ ورنہ تمام کتب تفسیر و حدیث میں بھی یہ احکام موجود ہیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے" وجوب النفیر " یعنے جب حفاظت کی ضرورت پیش آجائے تو قتال کے لیے سب اٹھ کھڑا ہونا واجب ہے۔ پھر آیہ" اِنفِرُوا خِفَافاً وَّ ثِقَالاً" (۹: ۴۱) اور مَالَکُمۡ اذا قِیل لَکُمُ انۡفِرُوا"(۳۸:۹)(الخ) سے وجوب پر استدلال کیا ہے اور اس کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے"لا هجرة بعدالفتح ولكن جهاد ونية واذا استنفرتم فانفروا"یعنی وہ جو اوائل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی تو فتح مکہ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے تو جب جمع ہونے کے لیے پکارے جاؤ جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے"الا ان تدعوا الحاجة اليه كان يدهم العدو يتعين على عينه الامام"(جلد۶:۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے"اذا كان الكفار مستقرين ببلادهم فالجهاد فرض كفايه ان اقام به بعضهم سقط الحرج عن الباقين و اذا قصدوا بلادنا واستنفر الامام المسلمين وجب على الاعيان"یعنی اگر کفار اپنے اپنے ملکوں میں ہیں مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے تو پھر فرض عین ہو جائے گا۔

چونکہ جابجا" نفیر" کا لفظ آیا ہے اس لیے یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے؟ اس سے یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا نفیر عام کی حالت پیدا نہ ہوگی؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دے دیا ہے۔

"نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود استنفار را چوں منح کینم حاصل شود حالتے کہ مقتضائے استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین و کافرین و عدم کفایہ ازاں مسلمانان انچہ بداں ماند (مسوی جلد۲:۱۲۹)

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو

مقتضائے نفیر ہے۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہوگئی تو جہاد فرض ہو گیا اور جب دشمنوں کی حاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور ان کی شکست کا خوف ہوا تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر جہاد فرض ہو گیا۔ خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و بدحالی ہے۔ ان کا فرض ہوگا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا جب وقت آ جائے تو خواہ موذن کی صدائے ''حی علی الصلوۃ'' سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آ جانا وجوب کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ترتیب وجوب دفاع

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہوگیا تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے۔ عقل وحکمت کی بناء پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہوسکتی تھی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا تو اس شہر کے تمام مسلمانوں پر بہ مجرد قصد اعداء دفاع فرض عین ہوگیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان، تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے کافی قوت نہیں رکھتے دشمن بہت زیادہ قوی ہے۔ یا قوت تو رکھتے ہیں مگر غفلت وتساہل کرنے لگے ہیں تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہوجائے گا بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ۔

مگر صورت اس کی یوں ہوگی کہ پہلے اس مقام سے قریب تر مقامات کے مسلمانوں پر واجب ہوگا، پھر ان سے قریب تر پر پھر ان سے قریب تر پر حتی کہ مشرق ومغرب، جنوب وشمال، تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہوجائے گی۔

اس وقت سارے فرائض، سارے وظائف، سارے کام ملتوی کردینے چاہئیں۔ بہ مجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور ساز وسامان کے ساتھ وقف دفاع ملت وجہاد فی سبیل اللہ ہوجانا چاہیے اور قیام دفاع کے لیے شرعاً جن جن وسائل وانتظامات کی ضرورت ہے۔ سب کو مل جل کر ان کا انتظام کرنا چاہیے۔ اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام وپیشوا نہیں ہے جو نظم وقیام اپنے ہاتھ میں لے تو سب کا فرض ہوگا کہ پہلے امام وامیر کا انتظام کریں۔ پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو ان کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر وسعی کام میں لائیں اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ سب مبتلائے معصیت وفسق ہوں گے۔ ایسی معصیت، ایسا فسق، ایسا عدوان، ایسا نفاق جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے۔

اگر قیامت کا آنا حق ہے اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے تو مسلمانان عالم کے پاس اس وقت کیا جواب ہوگا جب قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تم کروڑوں کی تعداد میں زندہ وسلامت موجود تھے تمہارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی، تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کرلیا گیا تھا، تمہارے کان بہرے نہ تھے، نہ ہاتھ کٹے ہوئے اور پاؤں لنگڑے تھے پھر تمہیں کیا ہوگیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے

بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں، وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو گئیں۔ پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنبش ہوئی، نہ تمہارے قدموں میں حرکت ہوئی، نہ تمہاری آنکھوں نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بہایا اور نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل و زر پرستی کے قفل ٹوٹے۔ تم نے چین اور آرام کے بستروں پر لیٹ لیٹ کر بربادی ملت اور پامالی اسلام کا یہ خونیں تماشا دیکھا اور اس بے درد تماشائی کی طرح بے حس و حرکت تکتے رہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا ہو!

"ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاٰخرۃ؟ فماامتاع الحیاۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل"!

(تم آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی زندگی میں مگن رہے (کیا تمہیں معلوم نہ تھا) دنیا کا عیش و آرام چند روزہ ہے)؟

فتح القدیر میں ہے

"فیجب علی جمیع اهل تلک البلدۃ النفر، وکذا من یقرب منهم ان لم یکن باهلها کفایۃ وکذا من یقرب ان لم یکن باهلها کفایۃ وکذا من یقرب ممن یقرب ان لم یکن بمن یقرب کفایهۃ اوتکاسلوا وعصوا وهکذا الی ان یحب علی جمیع اهل الاسلام شرقاً وغرباً" (جلد۴ صفحہ۲۸۰)

اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض عین ہو جائے گا اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کے لیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں تو جو مسلمان ان سے قریب ہوں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور اگر وہ بھی کافی نہیں یا انہوں نے سستی کی یا دانستہ انکار کیا تو پھر ان تمام لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں یہ فرض عائد ہوگا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے اس کا وجوب منتقل ہوتا جائے گا۔ حتی کہ تمام مسلمانوں پر خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض ہو جائے گا۔ انتہا

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ و حدیث میں ہے۔ عبارتوں کے نقل و ترجمہ میں طول ہوگا۔ ردالمختار وغیرہ کی شروح میں ذخیرہ سے نقل کیا۔

"فاما من ورائهم ببعد من العدو، فهو فرض کفایۃ علیهم حتی یسعهم ترکه، اذا لم یحتج الیهم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ ، اولم یعجزوا عنها لکنهم تکاسلوا، فانه

یفترض علی من یلیہ فرض کالصلوۃ والصوم لایسعھم ترکہ وثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الاسلام شرقاً وغرباً".

اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

"ثم الجھاد یصیر فرض عین عند النفیر العام علی من یقرب من العدو وھو یقدر علیہ، واما من ورائھم فلایکون فرضاً علیھم الا اذا احتیج الیھم اما بعجز القریب، واما للتکاسل، فحینئذ یفرض علی من یلیھم" الخ

اور شرح موطا میں ہے:

"فان لم تقع الکفایۃ بمن نزل بھم یجب علی من بعد منھم من المسلمین عونھم" (جلد۲۔۱۲۹)

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں جن میں وجوب دفاع کے لیے یکے بعد دیگرے اس ترتیب اور "الا قرب فالاقرب" کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانان عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت تمام مسلمانان عالم سے طالب اعانت ہو یا اس کی بے بسی و بے چارگی کی حالت ایسی ہو جائے کہ بلا تمام مسلمانان عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی وفتح ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام یعنی جزیرہ عرب پر غیر مسلم حملہ آور ہوں۔ جن کو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔ تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

◆......◆......◆

جزیرۂ عرب و بلادِ مقدسہ

مرکزِ ارضی

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کا کوئی ارضی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی، جب تک اس کی ایک قائم و جاری درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا جاری نہیں رہ سکتا جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔

نظامِ شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکزِ شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا معلق کارخانہ سنبھال رکھا ہے، اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۲:۱۳) یہی قانون الٰہی ہے جس پر اسکی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کی بقا اور حق و ہدایت کے قیام کے لیے ہر طرح کے مرکز قرار دیے، ضروری تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کے لیے قرار دے دیا جاتا۔

ان بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمینِ حجاز کو اپنے مرکز کے طور پر منتخب کیا یہی ناف زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کے لیے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی اور چونکہ سرزمین حجاز جزیرۂ عرب میں واقع تھی، وہی اسلام کا اولین وطن، وہی اس کا سب سے پہلا سرچشمہ تھا اس لیے ضروری تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گردو پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ تمام سرزمین بھی جو کہ حجاز کی ''وادی غیر ذی زرع'' کو گھیرے ہوئے ہے اسی حکم میں داخل ہو گئی۔ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. (۹۶:۶)

''مرکز ارضی'' سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الملی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزا تمام کرۂ ارضی میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزا کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا، جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کے لیے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا کہ سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں کھنچ کر سمٹ جاتے۔ تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملتی۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب

ہوتی۔ ہر ستارہ اس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر دوری اس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اس سے مواصلت ملتی۔ ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔

وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک وسطی درسگاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرۂ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کے لیے نقطۂ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا ٹھنڈی پڑ جاتی پر اس کا تنور کبھی نہ بجھتا۔ ساری دنیا تاریک ہوجاتی، مگر اسکی روشنی کبھی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا اولادِ آدم کے باہمی جنگ و جدال اور فتنہ وفساد سے خون ریزی کی دوزخ بن جاتی پھر بھی ایک گوشۂ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن و رحمت کی بہشت ہوتا اور انسانی فتنہ وفساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑ سکتی۔

اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہوتا اس کا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہوجاتا اور اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدوسیت کی جلوہ گاہ ہوتا۔ خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم وفساد کی نجاست سے آلودہ کرسکتا۔ پر اس کی فضائے مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسان کی سرکشی اپنی مجرمانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی سچی بادشاہت کا تختِ عظمت و جلال بچھ جاتا اور اس کا ظلِ عاطفت تمام بندگانِ حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا۔

دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا، مگر سچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا، جہاں خدا اور اس کی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی، نہ کسی صدا کی گونج اٹھ سکتی۔

وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کے لیے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا۔ کٹ کٹ کر قومیں وہاں جڑتیں اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹتیں۔ پرند جس طرح اپنے آشیانوں کی طرف اڑتے ہیں اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اس کی طرف دوڑتے اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اس تک پہنچ سکتیں، ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رہتیں۔

دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطر روحوں کے لیے اس کی آغوشِ گرم میں آرام و سکون کی ٹھنڈک ہوتی۔ گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے اور محرومی و نامرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل چیختے اور تڑپتے ہوئے اس کی جانب دوڑتے تو اس کی پاک ہوا کو امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار ہوجاتی، اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں اور اس کی مقدس فضا میں رحمت کے فرشتے غول در غول اتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت و قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی جڑ اگر سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھانے سے باغ اجڑ نہیں جاتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں گی تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے تو اس سے منسوب قوم کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بربادی سے قوم نہیں مٹ سکتی۔ سارے ٹکڑے مٹ جائیں، مگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی شاخیں پھوٹ آئیں گی اور نئی نئی زندگیاں ابھریں گی۔ پس جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کے لیے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا، اسی طرح ان کی ارضی وسعت و پھیلاؤ کے لیے عبادت کدہ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ، اس کی سرزمین حجاز، اور اس کا ملک جزیرۂ عرب دائمی مرکز قرار پایا۔ یہی معنی ان آیات کریمہ کے ہیں کہ:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰماً لِلنَّاسِ (۵:۹۷)

اللہ نے کعبہ کو جو اس کا محترم گھر ہے انسانوں کے بقاء و قیام کا باعث (اور مرکز) ٹھہرایا۔

وَاِذْجَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا (۲:۱۲۵) اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کے لیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا

اور

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳:۹۷) جو اس کے حدود کے اندر پہنچ گیا، اس کے لیے کسی طرح کا خوف اور ڈر نہیں۔

اور یہی علت تھی تحویل قبلہ کی نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی!

وَحَيْثُ مَاكُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲:۱۵۰)

اور تم کہیں بھی ہو، لیکن چاہیے کہ اپنا رخ اسی کی جانب رکھو!

کیونکہ جب یہی مقام ارضی مرکز قرار پایا تو تمام افراد قوم کے لیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، رخ ان کا اسی طرف رہے اور دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کی طرف متوجہ ہوتے رہیں اور یاد رہے کہ من جملہ بیشمار مصالح و حکم کے، ایک بڑی مصلحت فریضہ حج میں یہ بھی ہے کہ ساری امت، تمام کرۂ ارضی اور تمام اقوام عالم کو، اس نقطہ مرکز سے دائمی پیوستگی بخش دی۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالاً وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۲:۲۷)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ پھر ایسا ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشہ برکت کھینچ بلائے گا۔ لوگوں کے پیادے اور سوار قافلے دور دور سے یہاں پہنچیں گے۔

احکامِ شرعیہ

اس مرکز کے قیام وبقا کے لیے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ دائمی طور پر اس کو صرف اسلام کے لیے مخصوص کر دیا جائے جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی امت کے لیے اس مرکزیت کے مطلوبہ مقاصد ومصالح حاصل نہ ہوتے۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا.(۹:۲۸)

مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے لیے مخصوص ہیں اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں، بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔ جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطۂ کعبہ ہی نہیں ہے بلکہ تمام سرزمینِ حرم ہے اور دلائل ومباحث اس کے اپنے مقام پر درج ہیں۔

اور اسی طرح احادیث صحیحہ وکثیرہ سے جو حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، انس، جابر، ابو ہریرہ، عبداللہ بن زید، رافع بن خدیج، سہل بن حنیف وغیرہم اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے اور عیر وثور اس کے حدود ہیں۔ **المدینة حرام مابین عیر الی ثور**" اخرجه الشیخان اور روایت سعد کہ "**انی احرم مابین لابتی المدینه ان یقطع عضاها او یقتل صیدها**" رواہ مسلم اور روایت انس متفق علیہ کہ "**اللهم ان ابراهیم حرم مکه، وانی احرم مابین لا بیتها**" خدایا! ابراہیم نے مکہ کو حرم ٹھہرایا اور میں مدینہ کو حرم ٹھہراتا ہوں۔

یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے، باقی رہا اس کا گردوپیش یعنی جزیرۂ عرب، تو گو اس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی تاہم اس کا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا تا کہ اسلامی مرکز کا گردوپیش اور اس کا مولد ومنشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ رہے۔

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علاوہ مشرکینِ عرب کے یہود ونصاریٰ کی ایک بڑی جماعت جزیرۂ عرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے۔ خیبر میں انہی کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔

مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی۔ آخری جماعت جو مدینہ

سے خارج کی گئی بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا۔ امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے "ان یهود بنی النضیر حاربوا رسول الله صلی الله علیه وسلم فاجلی بنی النضیر واقر قریظة ومن علیهم حتی حاربت قریظة فقتل رجالهم وقسم اولادهم ونسائهم بین المسلمین الا بعضهم لحقوا برسول الله فامنهم واسلموا، واجلی یهود المدینة کلهم بنی قینقاع وهم قوم عبدالله بن سلام ویهود بنی حارثه، وکل یهودی کان بالمدینة."

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ بروایت حضرت ابو ہریرہ مروی ہے۔ آپ صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا "یامعشر الیهود اسلموا تسلموا" اسلام قبول کرو نجات پاؤ گے۔ پھر فرمایا۔ "اعلموا ان الارض لله ورسوله وانی ارید ان اجلیکم من هذه الارض، فمن وجد منکم بماله شیئا فلیبعه، والافاعلموا ان الارض لله ورسوله. میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کردوں۔ پس اپنا مال ومتاع فروخت کرنا چاہو تو کردو ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے ہے۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو دو مقام ایسے رہ گئے تھے جہاں سے یہود و نصاریٰ کا اخراج نہ ہوسکا تھا خیبر اور نجران۔ پس آپ نے وصیت فرمائی کہ آئندہ جزیرۂ عرب صرف اسلام کے لیے مخصوص کردیا جائے۔ جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے ہیں خارج کردئے جائیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے "اخرج الیهود من جزیرة العرب". اس میں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں جو اوپر گزر چکی۔ دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے۔ آنحضرتؐ نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ تھی "اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب".

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: اقتصر علی ذکر الیهود لانهم یوحدون الله تعالٰی الا القلیل ومع ذلک امر باخراجهم، فیکون اخراج غیرهم من الکفار بطریق اولٰی (فتح الباری ۶۔۱۹۴)

یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا۔ اس میں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں۔ ان کو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا وجوب بدرجۂ اولٰی ثابت ہوگیا۔ پس حاجت تصریح نہیں۔

حضرت عمر کی روایت میں "یہود و نصاریٰ" کا لفظ ہے "لاخرجن الیهود والنصارٰی من جزیرة العرب حتی لاادع الا مسلماً رواه مسلم واحمد والترمذی وصححه. ابوعبیده بن جراحؓ سے امام احمد نے روایت کیا ہے: آخر ما تکلم به رسول الله صلعم اخرجوا یهود اهل الحجاز و اهل نجران من جزیرة العرب۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں اس کی علت بھی واضح

کردی ہے۔ آخر ماعهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ان قال لا یترک بجزیرة العرب دینان" رواه احمد. یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں صرف اسلام ہی کے لیے مخصوص ہوجائے۔ امام مالک نے موطا میں عمر بن عبدالعزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کیے ہیں اور مصمودی وغیرہم نے باب باندھا ہے۔ "اخرج الیهود والنصاری من جزیرة العرب". عمر بن عبدالعزیز کی روایت میں ہے وکان من آخرما تکلم به رسول الله صلعم، انه قال قاتل الله الیهودوالنصاری، اتخذوا قبور انبیائهم مساجد. لایبقیان دینان بارض العرب. اور ابن شہاب کے الفاظ ہیں: "لایجتمع دینان فی جزیرة العرب"

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آخر تکلم "قاتل الله الیهود والنصاری جو نقل کیا ہے تو حضرت عائشہؓ سے صحیحین وغیرہا میں بطریق رفع بھی ثابت ہے۔

حافظ نواوی نے گو امام بخاری کا اتباع کیا اور اجلاء الیہود کا باب استدلالاً کافی سمجھا لیکن حافظ منذری نے تلخیص مسلم میں "اخراج الیهود والنصاری من جزیرة العرب" کا الگ باب باندھ کر جزیرۂ عرب والی روائتیں روایات اجلاء یہود سے الگ کردی ہیں۔ یہ وصیت نبویؐ علاوہ طرق بالا کے مسند امام احمد، مسند حمیدی، سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مروی ہے اور سب کا مضمون متحد اور باہمد گر اجمال وتبیین اور اعتقاد وتقویت کا حکم رکھتا ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح وتزکیہ سے ہوتا ہے۔ جیسے تمام اوامر ونواہی اور فرائض واجبات دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے جیسے فتح ممالک اور قوانین سیاسیہ وملکیہ۔

سنت الٰہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر ان کی تکمیل کا اعلان کرکے۔ لیکن دوسری قسم کے لیے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ بہت سے احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے نفاذ ووقوع کے لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل وتنفید پاتے ہیں۔ پس ان کی نسبت یا تو بطریق پیشین گوئی کے خبر دے دی جاتی ہے یا اپنے جانشینوں کو وصیت کردی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا۔ پس ضرور نہ تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں ہوجاتا۔ آپ ﷺ نے یہود مدینہ کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کردیا تھا۔ یہود خیبر سے ابتدا ہی میں شرط کرلی تھی کہ جب ضرورت ہوگی، اس سرزمین سے خارج

کردیے جاؤ گے۔ پھر تکمیل کے لیے اپنے جانشینوں کو وصیت فرمادی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تکمیل کا وقت آ گیا اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کرکے خود ہی اس کا موقع پہنچا دیا۔ پس حضرت عمرؓ نے اس وصیت کی تحقیق کی اور جب پوری طرح تصدیق ہوگئی تو تمام صحابہ کو جمع کرکے اعلان کردیا۔ سب نے اتفاق کیا اور یہود خیبر وفدک سے خارج کردیے گئے۔ اسی طرح نجران سے بھی عیسائیوں کا اخراج عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے۔ **"مازال عمر حتی وجد الثبت عن رسول اللہ انہ قال لایجتمع بجزیرۃ العرب دینان، فقال من کان لہ من اھل الکتابین عھد فلیات بہ، انفذلہ، والافانی اجلیکم، فاجلاھم،(اخرجہ ابن ابی شیبہ)**

امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب **"اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک"** میں درج کیا ہے اور ترجمہ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے عارضی ومشروط تھا بالاستقلال نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں حضرت عمر کے اجلا کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے۔

پس صاحب شریعت کے قول وعمل، ان کے آخری لحات حیات کی وصیت، حضرت عمر کی تفحص تصدیق، تمام صحابہ کے اجماع واتفاق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے جزیرۂ عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کردیا ہے الا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفۂ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دیدے اور ظاہر ہے کہ جب وہاں غیر مسلموں کا قیام اور دو دینوں کا اجتماع شریعت کو منظور نہیں تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی وبالادستی کو جائز رکھنا کب مسلمانوں کے لیے جائز ہوسکتا ہے۔

حواشی

[1] زیادہ مفصل بحث رسالہ "جامع الشواہد" میں لکھ چکا ہوں۔ اس رسالہ کا اصل موضوع مسئلہ خلافت ہے۔ یہ ٹکڑہ ضمناً آ گیا ہے پس اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

جزیرۂ عرب کی تحدید

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرۂ عرب سے مقصود کیا ہے؟ تو یہ بالکل صاف وواضح ہے اس کے لیے کسی بحث ونظر کی ضرورت ہی نہیں۔ نصِ حدیث میں "جزیرۂ عرب" کا لفظ وارد ہے اور عقلاً واصولاً معلوم ہے کہ جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو، کسی لفظ کے منطوق اور عام ومتعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا اور نہ بلا نصّ کے قیاساً تخصیص جائز۔ شارع نے "جزیرۃ" کا لفظ کہا اور دنیا میں اس وقت سے لے کر اب تک جزیرۂ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان رہا ہے پس جو مطلب اس کا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے وہی سمجھا جائے گا۔

تمام مورخین اور جغرافیہ نگارانِ قدیم وجدید متفق ہیں کہ عرب کو "جزیرۂ" اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک جانب دریا کے پانی سے محصور ہے۔ یعنی تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، بحر احمر وقلزم واقع ہیں ایک جانب دریائے دجلہ وفرات۔

فتح الباری وغیرہ میں ہے "قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب لان بحر فارس وبحر حبشۃ والفرات والدجلہ احاطت بھا (۱۱۸:۶) اور اصمعی کا قول ہے: لاحاطۃ البحار بھا، یعنی بحر الھند والقلزم وبحر فارق وبحر الحبشہ ودجلہ (ایضاً)

نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔ سمیت جزیرہ لان بحر الفارق وبحر سوڈان احاط بجانبیھا، واحاط بالجانب الشمالی دجلہ والفرات"

یہی قول اربابِ لغت کا بھی ہے۔ قاموس میں ہے۔ جزیرۃ العرب مااحاط بہ بحر الھند والشام ثم دجلہ والفرات. پروفیسر بطرس بستانی نے بھی (جو زمانۂ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے اور جس نے عربی میں انسائیکلوپیڈیا لکھنی شروع کی تھی) محیط المحیط میں یہی تعریف کی ہے۔

حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرۂ عرب وہ سرزمین ہے جس کے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ وفرات

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں دیا ہے۔ اس سے زیادہ جامع ومعتبر کتاب عربی میں جغرافیہ وتقویم بلدان کی کوئی نہیں۔

اما سمیت بلاد العرب جزیرۃ لا حاطۃ الانھار و البحار و ذٰلک ان الفرات اقبل من بلاد الروم، فظھر بناحیۃ قنسرین، ثم انحط علی اطراف الجزیرۃ و سواد العراق، حتی وقع بالبحر فی ناحیۃ البصرۃ والایلہ، وامتد الی عبادان، و اخذ البحر فی ذٰلک الموضع مغربان منعطفاً ببلاد العرب" الخ

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اس لیے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا ہے۔ صورت اس کی یوں ہے کہ دریائے فرات بلاد روم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جاملا۔ وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا اور قطیف و ہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شحر سے گزر گیا۔ پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا پچھم کی جانب یمن کے ساحلوں سے جاٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو کہ مکہ حجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طور اور خلیج ایلہ پر جاکر سمندر کی شاخ ختم ہوگئی۔ پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلزم نمودار ہوتا ہے۔ اور اس کا سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحلِ عسقلان ہوتا ہوا سرزمینِ صور و ساحلِ اردن تک بیروت پر پہنچتا ہے اور آخر میں پھر قنسرین تک منتہی ہوکر وہ جگہ آجاتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ پھر احمر اور قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں کیونکہ سوڈان سے دریائے نیل وہاں آپہنچتا ہے اور قلزم میں گرا ہے۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین عبارت ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے (انتہا مختصراً جلد ۳: ۱۰۰)

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ جزیرۂ عرب کے حدود کیا ہیں؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کرکے دیکھو اوپر شمال ہے دائیں مشرق بائیں مغرب، شمال میں دریائے فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا ہوا دجلہ میں مل جاتا ہے۔ پھر دونوں مل کر خلیج فارس میں گرتے ہیں فرات کے پیچھے دجلہ کا خطہ ہے۔ اسی پر بغداد واقع ہے۔ خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و حساء۔ پھر یہ خلیج تنگ نائے ہرمز سے نکل کر مسقط و عمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اس کے بعد ہی بحر عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضر موت کا ساحل دیکھو گے پھر عدن آگیا اور باب المندب سے جونہی آگے بڑھے بحر احمر شروع ہوگیا۔ چونکہ اس کا مغربی ساحل افریقہ و حبش سے متصل ہے، اس لیے قدیم جغرافیہ میں اس کو بحر حبش بھی کہتے ہیں۔ بحر احمر کے کنارے پہلے یمن ملے گا پھر جدہ۔ اس کے بعد ساحل حجاز حتیٰ کہ سمندر کی شاخ پتلی ہوکر طور سینا تک منتہی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نمودار ہوئی۔ اب مصر کی سرزمین شروع

ہوگئی۔ نہرِ سویز کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑا تھا جس نے بحرِ احمر کو بحرِ متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اس لیے صاحب معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا جس کو اسی درمیانی تختہ خشک کے بائیں جانب دیکھ رہے ہو وہ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر میں گرتا ہے۔ پس اگرچہ اس زمانے میں یہ ٹکڑا خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خط آبی موجود تھا۔

اس کے بعد بحرِ متوسط ہے جس کے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ نویس بحرِ مصر وشام سے موسوم کرتے تھے۔ اسی پر بیروت واقع ہے۔ اور ساحل سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا جہاں سے دریائے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بڑھا تھا۔

پس یہ ایک مثلث نما ٹکڑا ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے یعنی سرحد شام۔ یہی مثلث ٹکڑا جزیرہ عرب ہے۔ قدیم وجدید جغرافیہ نگار، دونوں اس پر متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے ''جزیرہ'' اور ''جزیرہ نما'' ہونے میں سب سے زیادہ اہم وجود دریائے دجلہ وفرات کا ہے۔ کیونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے تو پھر اس کی یسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے۔ یعنی شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی، احاطہ بحر ونہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لے کر حدود متعین کیے انہوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ شمالی حد دجلہ ہے۔ نہایہ، معجم البلدان اور فتح الباری میں اصمعی کا قول منقول ہے۔ **من اقصی عدن ابین الی ریف العراق طولا ومن جدہ ساحل البحر الی اطراف الشان عرضا**'' کرمانی نے کہا ''**ھی مابین عدن الی ریف العراق طولا ومن جدہ الی الشام عرضاً**''۔ یہی قاموس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلبی سے مروی ہے۔ رفاعہ بک طہطاوی نے قدیم وجدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں'' **تعریفات النافعہ لمزید الجغرافیہ**'' لکھی۔ اس میں یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہو گیا کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحرِ احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں داہنی جانب دجلہ ہے اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام۔ آج کل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے یہی حدود بتلائے جاتے ہیں۔ پچھم میں بحرِ احمر، دکھن میں بحرِ ہند، پورب میں خلیج فارس اور اتر میں ملک شام۔

اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ای **انھا اسفل ارض العرب** (جلد۶: ۱۳۳) یعنی عراق اس لیے نام ہوا کہ یہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے۔ اس

سے بھی ثابت ہوا کہ عراق عرب میں داخل ہے۔ البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے اس میں داخل نہ ہوگا۔

ہم یہاں عرب کا ایک نقشہ تفسیر البیان کے مسودہ سے لے کر درج کرتے ہیں۔ اس نقشہ میں ظہور اسلام کے وقت جزیرۂ عرب کی حالت دکھلائی ہے۔ یہ نقشہ دراصل یورپ کے بعض مشہور مستشرقین (اورئیلسٹ) نے قدیم نقشوں اور تعریفات سے مدد لے کر تیار کیا تھا جس کو سنہ ۱۸۵۰ء میں پروفیسر فرڈیننڈ ویسٹن فیلڈ (Ferdinand Westenfeild) نے لندن یونیورسٹی سے شائع کیا۔ جزیرۂ عرب کے تمام قدیم نقشوں میں سب سے زیادہ صحیح اور مستند نقشہ یہی ہے۔ نقطوں کے خطوط سے تجارتی قافلوں کی وہ سڑکیں دکھلائی ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے اندرونی مقامات سے سواحل تک جاتی تھیں۔

(نقشہ)

اخرجوا الیہود و النصاری من جزیرۃ العرب (الحدیث)

مسجد اقصیٰ وارض مقدس

مقامات مقدسہ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اس کی سرزمین کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے لیے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جس قدر حرم مکہ اور حرم مدینہ کی ہے۔

اسلام نے صرف تین مقامات کے لیے نیت طاعت وثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں جس طرح مکہ و مدینہ کا نام ہے، اسی طرح بیت المقدس کا بھی ذکر ہے۔ بخاری ومسلم کی مشہور روایت میں ہے۔ **لا تشد الرحال الا الی ثلاثہ مساجد: المسجد الحرام، و مسجدی ھذا والمسجد الاقصیٰ** "یعنی بہ نیت زیارت وطاعت سفر کا قصد واہتمام کرنا نہیں ہے۔ مگر ان تین جگہوں کے لیے مسجد حرام، مدینہ اور مسجد اقصیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے شرعاً بھی تین مقام سب سے زیادہ مقدس ومحترم ہیں اور انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی زیارت کے لیے نیت کر کے اپنے وطنوں سے نکلتے ہیں، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس کے معاوضہ میں ان کے لیے بڑا ہی اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمہ اسلام نے اتفاق کیا ہے کہ اگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کی نذر مانی ہو تو اس کا ادا کرنا اسی طرح واجب ہوگا جس طرح زیارت مسجد نبوی اور حج وعمرہ کا ادا کرنا۔ حالانکہ ان تین جگہوں کے علاوہ اگر کسی دوسری زیارت گاہ کے سفر کے لیے نذر مانی ہو تو اس کا ادا کرنا باتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اسی بات سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام و اعتقاد میں کیسا اہم درجہ رکھتی ہے!

یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس کا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ اور دنیا کی حکومت وعزت کے ساتھ یہاں کی بادشاہت بھی ان سے چھین لی گئی پھر مسیحی دور شروع ہوا۔ اس کے بعد مسلمان وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی" وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱:۱۰۵-۱۰۷) حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ اس

آیت میں ''الارض'' سے مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے۔ اس میں خبر دی گئی تھی کہ اب وہاں کی بادشاہت مسلمانوں کے حصہ میں آئے گی۔ اسی لیے کہا ان فی ھذا لبلاغا الخ

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سرزمین کی خدمت و وراثت کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ و امانت سمجھا اور اس کی حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت و فرمانروائی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب سمجھتے رہے۔ یہی اعتقاد دینی تھا جس نے مسیحی جہاد کی ان آٹھ لڑائیوں کو کامیاب ہونے نہ دیا۔ جن میں تمام یورپ کی طاقت اکٹھی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹکل طاقت کے عروج کا نہ تھا۔ تنزل و انحطاط کا تھا اور تمام عالم اسلامی مختلف حکومتوں میں متفرق ہو چکا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہاں کی حکومت خلیفہ اسلام کے ماتحت رہی ہے۔ اور ہمیشہ خود یورپ نے مسیحی دنیا کے امن و سکون کے لیے اسی بات کو بہتر سمجھا ہے۔ پس اگر آج پھر ازمنۂ مظلمہ (ڈارل ایجز) کی تاریخ دہرائی جائے گی اور اسلام کی جگہ اسے مسیحیت یا یہودیت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائے گی تو مسلمانان عالم کے لیے ناممکن ہوگا کہ خاموش رہ سکیں۔ ان کا فرض ہوگا کہ جب گزشتہ کروسیڈ کا ایک حصہ دہرایا گیا ہے تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آ جائے۔ وہ مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے، ان کا مقدس اولین قبلہ ہے۔ اس کی مذہبی وابستگی ان کے ایمان و مذہب کا جزو ہے۔ گر وہاں یہودیوں کا اقتدار بڑھایا جاتا ہے یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالادستی کے نام سے قائم کیا جاتا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کی آبادیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی شریعت کو چیلنج دینا ہے اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں یا اس کی اطاعت و حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

باب

خاتمۂ سخن

نتائجِ بحث

گزشتہ مباحث وتفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اسلام کا قانونِ شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ وامام ہونا چاہیے۔ "خلیفہ" سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحبِ حکومت ومملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء ونفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔

(۲) اس کی اطاعت واعانت ہر مسلمان پر فرض ہے اور مثلِ اطاعت خدا اور رسول ﷺ کے لیے ہے تاوقتیکہ اس سے کفر بواح (صریح) ظاہر نہ ہو۔ جو مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہوگیا۔ جس مسلمان نے اس کے مقابلے میں لڑائی کی یا لڑنے والوں کی مدد کی اس نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ وہ اسلام سے باہر ہوگیا اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلم سمجھتا ہو۔

(۳) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم چکی ہے اور پھر کوئی مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا اور اپنی حکومت کا دعوٰی کیا تو وہ باغی ہے اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

(۴) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہے اور اس وقت اَز رُوئے شرع تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ وامام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت واعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت قبول کی۔ جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔

(۵) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے یا ان کی مدد کرے۔ اگر کرے گا تو بہ حکم "من حمل علینا السلاح فلیس منا" اور نص

قرآنی "مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا" (۴:۹۳) وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

(۶) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں یا حملہ کا قصد کریں یا ان کی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے ان کی مدد کرنا اور حملہ کرنے والوں سے لڑنا، فرض ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں اور ان کے مقابلہ کی کافی طاقت ان مسلمانوں اور وہاں کی اسلامی حکومت میں نہ ہو اس صورت میں جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہ ہو گی بلکہ مثل نماز روزہ کے فرض عین ہو گی۔

(۷) اگر خلیفہ اسلام کو دشمنوں کا کوئی ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ ان کا مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو اور بلا تمام مسلمانان عالم کی فوری مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ ہو سکے تو اس صورت میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا بہ یک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اس کی مدد کریں اور اس کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں۔

(۸) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا رہا ہے۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔

(۹) اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے نہ دیں۔ علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا بلکہ یک وقت و بہ یک دفعہ تمام مسلمان عالم کا۔

(۱۰) اس صورت میں جو فرض شرعی مسلمانوں پر عائد ہوگا۔ اس میں پہلی چیز "ترک" ہے۔ دوسری "اختیار"۔ "ترک" سے مقصود یہ ہے کہ تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا پڑیں گے جن میں برٹش گورنمنٹ کی اعانت و موالات ہو۔ "اختیار" سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل اختیار کرنے پڑیں گے جن کے ذریعے فریضہ دفاع انجام پا سکے۔

و تلک عشرة کاملہ

خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ

جبکہ اسلام کے اٹل اور اپنے پیروؤں کے لیے دائمی احکام کا یہ حال ہے تو یکا یک ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ وسط یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتشگیر مادۂ جنگ بھڑک اٹھا نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدہ" (۱۰۴:۶-۷)۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جنگ نے مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسی نازک صورت اختیار کرلی جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پوری تاریخ میں آج تک کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کی فوجیں بھی میدان جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کردیا۔

اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشتہر کی گئی تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے نہ کہ حملہ آورانہ۔ ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا اور پوری کوشش کی کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے۔ اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسا رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے جن میں عراق بھی داخل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کاروائی عمل میں نہ آئے گی۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کررہی ہے۔ خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام خلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلاصہ اس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر ۱۹۱۴ء کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہر کمشنری، ہر ضلع، ہر صدر مقام، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کرکے مقامی حکام نے اس کی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی بھی پڑھ کر سنایا تھا۔ برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملے گا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ

دیا گیا ہو۔ بعد کو "نیر ایسٹ" وغیرہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بجنسہ یہی اعلان شائع کیا گیا تھا۔

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہند و انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں۔ اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کی تکرار و اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ یہ اعلان شائع کیا گیا شاید ہی کوئی انسانی وعدہ اس قدر دہرایا گیا ہو۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس وقت میدان جنگ کا کیا حال تھا؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کے لیے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جس قدر ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اس کی کامیابی کی ضرورت تھی۔ اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہو جاتی تو نہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی اور آج نتائج کا کیا حال ہوتا۔

اس اعلان کا نتیجہ وہی نکلا جو مطلوب تھا۔ یعنی مسلمانانِ ہند پر صورت حال مشتبہ ہو گئی۔ نادان وحیلہ جو علماء اس خیال میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان و دولِ متحدہ پر حملہ کیا ہے تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ و ہجوم کی ہے۔ اس لیے اس میں شرکت فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے نہ کہ فرض عین کا۔ پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانِ ہند بھی اس میں حصہ لیں۔ عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بچاؤ کر رہی ہے۔ اس کا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفۂ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔ ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جاتا ہے بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی۔

نہایت افسوس اور رُوسیاہی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا نہ وعدوں اور اعلان پر اعتماد۔ انہوں نے اپنی تیرہ سو سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی جیسی اس موقع پر کی اور جس کے نتائج کی پہلی قسط آج ان کے سامنے ہے "وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ"(۳:۱۱۸) فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"(۹:۷۰)

تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطع نظر کر لو کہ احکامِ شرع کی بنا پر یہ رائے کہاں تک صحیح تھی صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسا کیا گیا ان کا حال کیا تھا؟

پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سوسائٹی بھی اشخاص کے لیے ضروری سمجھتی ہے کہ

ایفائے عہد میں اپنے تئیں شریف ثابت کریں لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کے لیے شریف ہونا چنداں ضروری بات نہیں ہے۔ اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا وہم وگمان بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جب وعدوں کا ایفا اور عہد و پیان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جائے جو اپنی وفاداری میں کتنے کی طرح قابلِ تعریف مگر بے زبانی میں اسی کی طرح بے بس بھی ہے۔

انگلستان کی حکومت نے نپولین کے عہد سے لے کر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے، ان کی عبرت انگیز سرگزشت صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہے۔

برطانوی وعدوں کے اعتماد اور ان کے ایفا کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۱۵ء کو جب نپولین نے بلرافان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا۔ کچھ بے اعتمادی نہ کی تھی لیکن خود اسی کے لفظوں میں انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کے لیے بلایا اور جب وہ آ گیا تو اس کا خاتمہ کر دیا۔

سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طوفان کے اندر انگریزی مواعید کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں!

۴-اگست ۱۸۱۵ء کو جنگ واٹرلو کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا۔ جس پر انگلستان کے نامور ہیرو ڈیوک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا۔ لیکن قبضہ کے بعد جب یہ نتیجہ نکلا کہ اس پر تاریخ کا اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور خود انگریز مورخوں کی زبانی اس کا افسانہ خونیں سن لیا جا سکتا ہے۔

خود ہندوستان کے گزشتہ سو سال کی تاریخ ہی اس کے لیے کافی ہے، دوسرے ملکوں کی سرگزشتوں کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت کیا ہے!

شمشاد خانہ پرور ماز کے کشتہ ست

تاہم بدبخت مسلمانوں نے بھروسا کیا اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ان کا روپیہ ان کی جانیں، ان کے ملک کی تمام قوتیں بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے مٹانے میں ان کی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جس کا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی دیتا ہی ہے۔

اثناء جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فوج قابض

ہوگئی تھی جو جزیرہ عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہے۔ عین حدود حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغاوت کرائی گئی اور اس کی وجہ سے جس قدر توہین اس مقدس مقام کی ہوئی تھی وہ ہوکر رہی۔ پھر بھی مسلمانانِ ہند اپنے اعتماد سے دستبردار نہ ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد برطانوی اعلان و مواعید کی مقدس صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائے گی۔

موجودہ و آئندہ حالت اور احکامِ شرعیہ

بحث کے اس ٹکڑے کو ہم وانستہ حذف کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نہ ہم ان پیہم اعلانات کا یہاں ذکر کریں گے جن کا سلسلہ برابر اثنائے جنگ میں بھی جاری رہا۔ مثلاً وزیر اعظم کی تقریر ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں اور سورج کی روشنی جن چیزوں کو دکھلا دے ان کے لیے بحث ونظر کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ نہ اب کوئی بات ہمارے لیے سوچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے نہ گورنمنٹ کے لیے۔

وہ صرف موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے۔

احکام شرعیہ اوپر گزر چکے ہیں۔ پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف وہی حملہ آورانہ جنگ عمل میں لائی گئی جس کا اظہار ہو رہا ہے تو نتائج حسب ذیل ہوں گے:

(۱) جس وقت خلیفۃ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو برٹش گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ حملہ ان کی جانب سے ہے، انگلستان و خلفاء کی جانب سے نہیں ہے۔ لیکن اب موجودہ حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفہ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں اور خلیفۃ المسلمین پر حملہ آور ہیں پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا تو مسلمانوں کے لیے قطعاً صورت دفاع اور نفیر عام کی پیدا ہو جائے گی جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ حملہ وہجوم کی صورت نہ ہوگی کہ فرض علی الکفایہ ہو۔ لہٰذا ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ شرعی فرض ہوگا کہ خلیفۃ المسلمین اور ان تمام اسلامی آبادیوں کی اعانت کے لیے اٹھ کھڑا ہو، جہاں سے اسلامی حکومت مٹائی جا رہی ہے۔

(۲) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی مگر چار سال کی جنگ اور اس کے نتائج نے آخری درجہ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفۃ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم حریفوں کے مقابلے کے لیے کافی ہے، نہ موجودہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی۔ یعنی وہ شکست کھا چکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی

درماندگی وتباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے۔ جیسے ولایت سمرنا وغیرہ کے مسلمان۔ پس اس بنا پر بھی مسلمانان ہند کا فرض شرعی ہوگا کہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) جن بلادِ اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں مثلاً ایڈریانوپل تھریس ایشیائے کوچک، سمرنا، عراق، فلسطین، ان کے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے اور اس کی اعانت کی وجہ سے مسلمانانِ ہند بری الذمہ ہو جائیں۔ پس اس بنا پر بھی ساری شرعی ذمہ داری مسلمانانِ ہند ہی کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ جن کی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ ہے اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں۔

(۴) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرہ عرب میں داخل ہے پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا تو یہ صریح جزیرہ عرب پر غیر مسلم اقتدار ہوگا اور از روئے شرع مسلمانانِ ہند کا فرض ہوگا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کے لیے حریف کا مقابلہ کریں۔

(۵) بیت المقدس اسلام کے مقامات مقدسہ میں داخل ہے۔ اگر اس پر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائے گا تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہوگا کہ دفاع کے لیے مستعد ہو جائیں۔

(۶) غرضیکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً جائز ہو جائے گا اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کش مکش ہوگی۔ جس میں کوئی انسانی جماعت مبتلا ہو سکتی ہے یعنی بہ مجرد ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت از روئے شرع یہ ہو جائے گی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے اور اس لیے اس سلوک کی مستحق ہے جو از روئے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جب ایسا ہوا تو مسلمان مجبور ہوں گے کہ دو راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ یا برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیں یا اسلام کا۔ یہ ناممکن ہوگا کہ دونوں تعلق ایک وقت میں جمع کیے جا سکیں۔

کیا چھ کروڑ سے زائد انسانوں کو اس کش مکش میں مبتلا کر دینا کوئی عاقبت اندیشانہ عمل ہو سکتا ہے! فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں۔ اگر عارضی فتحمندی کا گھمنڈ مہلت دے تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کر لے۔

اگر انگلستان کے وزراء (نپولین کے لفظوں میں) وعدہ اس لیے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے تو کم از کم اس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے جس کو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے یعنی کامل مذہبی آزادی کا وعدہ۔ اسی وعدہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روزمرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں، ان کی مسجدیں قائم ہیں۔ پانچ وقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ کوئی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو۔

لیکن اگر برٹش گورنمنٹ بلادِ اسلامیہ کے خلاف اپنے موجودہ طرزِ عمل پر قائم رہی، اس کے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لیے سمندروں میں دوڑتے رہے، اس کی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرہ عرب میں داخل ہے اور ساتھ ہی وہ اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بدبخت مسلمان اس کے وفادار بنے رہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں تو آزادی دینے کے لیے تیار ہے۔ لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور ان بڑے حکموں میں داخل ہیں۔ جن کے ترک کر دینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا۔ ان کے لیے چاہتی ہے کہ حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں۔

وہ مسلمانوں کو آزادی دیتی ہے کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسلامی خلافت و امامت پر حملہ آور بھی ہے جو شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ کے حکم میں داخل ہے۔

وہ نماز پڑھنے میں مداخلت نہیں کرے گی جس کے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہ گار ہو جاتا ہے۔ لیکن خلیفۃ المسلمین کو ان کی حکومت و مملکت سے محروم کر دے گی جن کی مدد نہ کرنے سے مسلمان گناہگار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جاتا ہے!

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی کیونکہ یہ ان کا مذہبی عمل ہے لیکن وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنی فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کرے گی کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالے کر دیں۔ اس وقت مسلمان دفاع کے لیے اٹھیں گے تو کہے گی کہ بغاوت ہے۔ پھر کیا دفاع مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا اور کیسا مذہبی عمل؟ ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھ کر حج اس کے لیے چھوڑ دیا جا سکتا ہے لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔

مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور ان کے اندر کی نمازوں کو لے کر کیا کریں گے جن کی اجازت دے دینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے جبکہ شریعت کے وہ احکام ان کے سامنے آ جائیں گے جن کی تعمیل ہزار نمازوں سے بھی بڑھ کر اور ہزار روزوں سے بھی اشد و اہم ہے اور جن کی نافرمانی کے بعد نہ تو ان کی نمازیں ہی ان کے لیے سودمند رہیں گے نہ ان کے روزے ہی ان کو نجات دلا سکیں گے!

باب

ترک واختیار
(ترک موالات)

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک واختیار دونوں طرح کے احکام شرعاً عائد ہوں گے۔

''ترک'' سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت کر رہے ہیں ترک کر دینی پڑیں گی۔

''اختیار'' سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت نہیں کر رہے ہے کرنی پڑیں گی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز وہ ہے جس کو شریعت نے ''ترک موالات'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف ودشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں ان سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ایسا تعلق رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہوگا مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے۔ تمام غیر مسلم اقوام وافراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں، نہ ان پر حملہ آور ہیں، نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی، محبت اور ہر طرح کے احسان وخیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیے، اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں۔ عالمگیر محبت اس کی دعوت حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں۔ اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے۔ یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ گناہ نہیں ہے نفاق ہے اور منافق مومن نہیں ہے۔

قرآن نے یہ تقسیم سورہ ممتحنہ میں کر دی ہے۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ

فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۰ اِنَّمَا یَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ(۶۰: ۸-۹)

اور اسی سورۃ کے اوائل میں فرمایا ، یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ (۶۰:۱) مسلمانو! جو غیر مسلم تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ان کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اور سورہ مائدہ میں ہے: لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵:۵۱) ان یہود و نصاریٰ کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں، اپنا دوست نہ بناؤ اور جو مسلمان انہیں دوست بنائے گا خدا کے حضور اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ واضح فرمایا: لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۳:۲۸) اور لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴:۱۴۴) یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم جنگ ہو تو مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کو اپنا دوست بنائیں۔ من دون المومنین جہاں جہاں آیا ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترک موالات نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کے محارب غیر مسلموں سے اور ایک خاص حالت جنگ میں اسی طرح سورہ عمران میں ہے: لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ (۳:۱۱۸)

یہاں ضمناً یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو شرعاً کیسا تعلق رکھنا چاہیے؟ سو معلوم ہوگیا کہ قرآن کی اس تقسیم کی بموجب وہ دوسری قسم میں داخل ہیں۔ پس ان کے ساتھ بر و احسان اور نیکی و ہمدردی کرنے سے شریعت ہرگز ہرگز نہیں روکتی۔ آج تک انہوں نے نہ کبھی اسلامی ممالک پر حملہ کیا، نہ مسلمانوں سے قتال فی الدین کیا، نہ کسی اسلامی ملک سے مسلمانوں کے اخراج کا باعث ہوئے۔

واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ

سورہ ممتحنہ کے شان نزول کا واقعہ اس بارے میں مسلمانوں کے لیے بڑا ہی عبرت انگیز ہے۔
بخاری و مسلم میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین صحابہ اور شرکائے بدر میں سے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے خیال سے ایک خط لکھ کر مکہ میں اطلاع دے دینی چاہی۔ وحی الٰہی سے آنحضرت اس پر مطلع ہو گئے اور راستے ہی میں سے خط پکڑوا منگوایا۔ جب حاطب سے پوچھا گیا تو انہوں نے معذرت کی "مافعلت هذا كفرا ولا ارتدادا" میں نے کفر اور ارتداد اور اسلام کی مخالفت کے خیال سے ایسا نہیں کیا۔ صرف اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے خیال سے خط بھیج دیا تھا، میری نیت بری نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں اور کہا "انه منافق قد خان الله و رسوله" یہ منافق ہے، اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے۔
اس پر سورہ ممتحنہ کا نزول ہوا۔

> يَٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ. (۱:۶۰)
>
> مسلمانو! خدا کے اور خود اپنے دشمنوں کو ایسا دوست نہ بناؤ کہ محبت الفت کے ان سے تعلقات رکھو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام سے انکار کر چکے ہیں اور اللہ اور اس کے دین برحق کے دشمن ہیں۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین و بدریین میں سے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے خیال سے خط لکھا تھا۔ دشمنان اسلام کی مدد کرنا مقصود نہ تھا۔ اس پر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا اور حضرت عمرؓ قتل کر دینے کے لیے اٹھے کہ یہ منافق ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ جب باوجود علاقہ قرابت، مخالف و محارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا تو پھر ان مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے جو برٹش گورنمنٹ کے محارب فریق ہونے پر بھی ہر طرح کی محبت و موالات اور اعانت و مشارکت کے تعلقات اس کے ساتھ رکھتے ہیں اور جن کا اب تک یہ حال ہے کہ اس کے درباروں کے دیے ہوئے بے سود خطابوں کو بھی ترک کر دینا ان کے

نفسِ حق فراموش پر گراں گزر رہا ہے۔

علی الخصوص ان مدعیانِ علم و تقدس کا حال قابلِ تماشا ہے جن کو ان کی بارگاہوں سے شمس العلماء کے خطابات ملے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں اسلام کی دینی ریاست کا اولین حق دار اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں۔ یا سبحان اللہ! مسلمانوں پر ان کی قومی بدبختی کا اس سے بڑھ کر اور کون سا وقت آ سکتا ہے! جن لوگوں کو اسلام اور اس کی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو اور جو اللہ کے نزدیک اس کے بھی حقدار نہ ہوں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں ان کو مسلمانوں کی ریاست و پیشوائی کا دعویٰ ہو، وہ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہوں کے مالک ہوں، جہاں صبح و شام قال اللہ اور قال الرسول کا چرچا رہتا ہے اور پھر اس سے بھی عجیب تو یہ کہ بہت سے مسلمان ہوں گے جو ان کی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہوں اور ان کے آگے عقیدت و ارادت کا سر جھکا کر اللہ اور اس کے رسول سے گردن موڑ رہے ہوں۔

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۳۹:۴)

جو مسلمان، مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے مخالف غیر مسلموں کو اپنا دوست بنا رہے ہیں تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بارگاہوں سے عزت حاصل کریں؟ اگر عزت ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ اصلی عزت دینے والے وہ نہیں ہیں عزت اللہ کے لیے ہے اور ایک مسلمان کو مل سکتی ہے تو اسی کی چوکھٹ سے۔

سورہ نساء میں یہ تمام خصلتیں منافقوں کی قرار دی ہیں جن میں آج ہمارے بڑے بڑے مدعیانِ علم و مشیخت مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اسلام و کفر دونوں سے ساز باز رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں اور اسلام کے مخالفوں سے بھی رسم و راہ جاری رہے مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (۱۴۳:۴) تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۱۴۴:۴-۱۴۵)

اسلام تو ایک مسلمان کے لیے یہ بات بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اس کے ماں باپ، بھائی بہن، مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں تو ان سے بھی کسی طرح کا واسطہ رکھے۔ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ(۹:۲۳)اور جو مسلمان ایسے وقتوں میں محارب غیر مسلموں سے محبت واعانت کا تعلق رکھیں خواہ وہ ان کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، ان کے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ(۵۸:۲۲) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بن کر دنیا کو دکھلا دیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں؟

پس اب فیصلہ کر لو کہ ان لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو ایسے وقتوں میں بھی محارب غیر مسلموں کے دیئے ہوئے خطابوں سے پیار کریں گے ان کے دیئے ہوئے تمغوں کو (جن سے اکثر اسلام فروشی ہی کے صلہ میں ملے ہیں۔ اپنے سینوں پر جگہ دیں گے، ان کی بارگاہوں میں جا کر اطاعت وتعبد کا سر جھکائیں گے، اور آہ، ان سب سے بھی بڑھ کر وہ، جو ان کی راہوں میں غلاموں کی طرح بچھیں گے ان کے حکموں پر کتوں کی طرح لوٹیں گے، ان کی خدمت و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان تک کو نثار کر دیں گے:

فیاللہ و للمسلمین من ھذہ الفاقرۃ التی ھی اعظم فواقر الدین، الرزیۃ التی مارزی بمثلھا سبیل المومنین:

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام و ایمان

هل للامام ان يمنع المتخلفين والقاعدين من الكلام معه والزيارة و نحوه؟

ایک اہم سوال شرعاً یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مسلمان باوجود تبلیغ و تفہیم محارب غیر مسلموں سے ترک موالات نہ کریں اور ان کی مؤدت واعانت سے باز نہ آئیں ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا سلوک کرنا چاہیے۔

حضرت کعب بن مالکؓ اور غزوہ تبوک کے متخلفین کا واقعہ گزشتہ باب میں گزر چکا ہے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مسلمان مصالح امت کے خلاف روش اختیار کریں اور دشمنانِ ملت کے دفاع میں باوجود استطاعت حصہ نہ لیں، ان سے بھی مسلمانوں کو ترک موالات کر دینا چاہیے۔

امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے **هل للامام ان يمنع المجرمين واهل المعصيه من الكلام معه والزيارة و نحوه**"؟ یعنی کیا مسلمانوں کے امام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ جو لوگ شرعی جرائم کے مرتکب ہوں، ان سے ملنے بات چیت کرنے اور اسی طرح کے دیگر تعلقات رکھنے سے لوگوں کو روک دے؟ اور پھر اس میں حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت درج کی ہے۔ گویا اس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کو ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ زجر و تنبیہ اور عبرت پذیری کے لیے ایسا کرنا اعمالِ نبوت کے ٹھیک مطابق ہوگا۔

امام بخاری کا یہ استدلال نہایت واضح اور صاف ہے۔ آنحضرتؐ نے تمام مسلمانوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی طرح کا واسطہ ان لوگوں سے نہ رکھیں، نہ سلام کریں، نہ کلام کریں، نہ ملیں جلیں۔ یہاں تک کہ ان کو بیویوں تک سے تعلقات زوجیت رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ بالآخر یہ حالت ہوگئی کہ "ضاقت عليهم الارض بما رحبت" پس اس سے ثابت ہوا کہ جب کبھی اسلام اور امت کی حفاظت اور دفاع کا وقت آ جائے اور تمام مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا ضروری ہو تو جس مسلمان کی طرف سے اس میں سستی و کاہلی ہو یا انکار و تخلف ہو اس کا جرم عند اللہ نہایت شدید و عظیم ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو حق پہنچتا ہے کہ زجر و تنبیہ کے لیے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ان تینوں شخصیات کے ساتھ کیا گیا تھا اور

جب تک وہ اپنے رویہ سے باز نہ آجائیں کوئی مسلمان ان سے کسی طرح کا علاقہ نہ رکھے۔ جب ان مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک جائز ہوا جو سابقین انصار اور شرکاء بدر میں سے تھے اور جن کا قصور بجز سستی اور کاہلی کے اور کچھ نہ تھا تو جو لوگ صریح طور پر اعداء اسلام کے ساتھ اطاعت و اعانت کے تعلقات رکھیں اور دفاع اسلام کی سعی و تدبیر میں شامل ہونے سے صاف صاف انکار کردیں ان کے لیے تو ایسا حکم دینا نہ صرف جائز و مشروع ہوگا بلکہ یقیناً واجب و لازم ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے امام حسن بصری کا کیا خوب قول نقل کیا ہے قال یا سبحان اللہ ما اکل هؤلاء الثلاثة مالًا حراما، ولا سفکوا دما حراما ولا افسدوا فی الارض اصابهم و اسمعتم و ضاقت بهم الارض بمارحبت فکیف بمن یواقع الفواحش والکبائر؟۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "و فیها ترک السلام علی من اذنب و جواز هجره اکثر من ثلاث و اما النهی عن الهجر فوق الثلاث فمحمول علی من لم یکن هجر انه شرعیا" [1] یعنی اس واقعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مجرمین شرع سے ترک سلام وکلام کرنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ان سے ترک تعلق کیا جاسکتا ہے۔ باقی رہی حدیث لا یحل لرجل ان یهجر اخاه فوق ثلاث یعنی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے جدا رہے تو اس سے مقصود وہ جدائی ہے جو بلا سبب شرعی ہو اور اس واقعہ میں جدائی کا حکم جرم شرعی کے ارتکاب کی بنا پر ہوا۔ پس زیادہ عرصہ تک ترک علائق جائز ہے۔

حافظ ابن قیم نے بھی ھدیٰ میں اس واقعہ سے یہ حکم مستنبط کیا ہے اور اپنے مخصوص طرز میں مشرح بحث کی ہے۔

حواشی

[1] امام بخاری اپنی عادت کے مطابق حدیث کعب کو مختلف ابواب میں لائے ہیں۔ باب متذکرہ متن کتاب الاحکام کا آخری باب ہے اور مفصل حدیث کتاب المغازی میں ہے۔ کتاب المغازی کی شرح میں حافظ موصوف کی یہ عبارت ملے گی۔ (ج ۸: ۹)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

بے جا نہ ہوگا، اگر یہاں ایک شبہ دور کر دیا جائے جو اس معاملہ کی نسبت ہوا ہے اور ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "استدل بعض المتاخرین لکو نهما لم یشهد ابدرا بما وقع فی قصة حاطب وان النبی صلعم لم یهجره ولاعاقبه مع کونه جس علیه بل قال لعمر لماهم بقتله لعل الله اطلع علی اهل بدر فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم. قال واین ذنب التخلف من ذنب الجس؟" یعنی بعض متاخرین نے اس سے انکار کیا ہے کہ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ شہداء بدر میں سے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کو یہ سزا نہ دی جاتی۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ سے خط و کتابت کی اور وہ جرم بڑا ہی سخت جرم تھا یعنی جاسوسی کا تھا۔ اس پر بھی بوجہ بدری ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا اور لوگوں کو ان کے ساتھ ترک تعلق کا حکم نہیں دیا۔ کعب اور ان کے ساتھیوں کا اس سے بڑھ کر تو قصور نہ تھا؟ پھر اتنی بڑی سخت سزا ان کو کیوں دی گئی؟ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاطب کی معافی ان کے بدری ہونے کی وجہ سے تھی اور یہ لوگ اس لیے ماخوذ ہوئے کہ بدری نہ تھے۔ انتہا

پھر حافظ موصوف نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ ضرور بدری تھے حاطب کو اس لیے کوئی سزا نہیں دی گئی کہ انہوں نے اپنے اہل وعیال کی حفاظت کا عذر پیش کیا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ پھر آگے چل کر سہیلی کا جواب نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کو سخت سزا اس لیے دی گئی کہ انصار میں سے تھے اور انصار نے آنحضرت کی حمایت کا خاص طور پر وعدہ کیا تھا۔ ان پر دوسروں سے کہیں زیادہ معیت و نصرت فرض تھی۔ اس میں کوتاہی ہوئی تو مستحق تعزیر ہوئے۔

ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شبہ جس قدر تعجب انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ ان اکابر و اعلام کے جوابات و تعلیلات تعجب انگیز ہیں۔ سخت حیرانی ہوتی ہے کہ ایک نہایت صاف و واضح معاملہ کی نسبت کیوں اس قدر غیر ضروری کاوشیں کی گئیں اور کیوں اصلی علت سامنے نہ آ گئی؟

حضرت ہلالؓ اور مرارہؓ کا بدری ہونا مسلم ہے۔ بخاری کی روایت میں خود حضرت کعبؓ کہتے ہیں "رجلین صالحین قد شهداء بدرا" اور حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ اور اس معاملہ میں کسی طرح کی منافات نہیں ہے۔ دونوں معاملے اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس واقعہ پر جن لوگوں کو تعجب ہوا

انہوں نے حکم دفاع کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی۔ اگر اس پر غور کر لیتے تو یہ شبہ پیدا ہی نہ ہوتا اور نہ ان کمزور توجیہوں کی ضرورت پیش آتی۔

ایک صورت عام طور پر حفظ ملک ونصرت قوم کی ہے اور ایک صورت خاص دشمن کے حملہ وہجوم کی ہے۔ پہلی حالت میں اگر جنگی احکام کی تعمیل میں سستی وکاہلی ہو تو اس درجہ سنگین نہیں ہوتی جس قدر دوسری حالت میں۔ پہلی حالت اندرونی امن کی ہے، دوسری بیرونی حملہ وجنگ کی۔ جنگ ودفاع کی حالت میں ایک ذرا سی سستی اور کاہلی بھی اتنا بڑا جرم ہوتی ہے کہ اس کی پاداش میں موت کی سزا کو بھی سخت نہیں کہا جاسکتا۔

اسی بنا پر شریعت نے ایک حالت تہیۂ جہاد و رباط خیل واستعداد کار کی قرار دی ہے دوسری حالت ''دفاع'' اور نفیر کی بتلائی۔ جب کسی دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہو اور مسلم وغیر مسلم جنگ کی حالت پیدا ہوگئی ہو تو وہ حالت دفاع کی ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں امن تھا۔ قریش یا کسی دوسرے دشمن کی طرف سے اس وقت حملہ کا خوف نہ تھا۔ خود مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے۔ کیونکہ قریش نے اپنا عہد ومیثاق توڑ دیا تھا۔

لیکن حضرت کعب بن مالکؓ کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہوں نے اس وقت ادائے فرض میں سستی کی جب دشمن کے حصہ وہجوم کا اعلان ہو چکا تھا اور چالیس ہزار رومیوں کے اجتماع کی خبریں آ چکی تھیں۔ وہ حملہ کا وقت نہ تھا دفاع کا تھا۔ امام نے حکم دے دیا تھا اور نفیر عام کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت ادائے فرض میں غفلت کرنا ایسا سنگین جرم ہے کہ کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ پس ضروری تھا کہ عبرت کے لیے کوئی سخت طرز عمل اختیار کیا جاتا تا کہ آئندہ ایسی غفلتوں کی کسی کو جرات نہ ہو۔

تعجب ہے کہ حافظ ابن قیم کو بھی ''ہدیٰ'' میں یہی شبہ لاحق ہوا اور اسی لیے انہوں نے ہلالؓ اور مرارہ کے بدری ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ **والغلط لایعصمہ الانسان**

گورنمنٹ کے لیے اصلی سوال

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد واغراض ہی سامنے رکھ کر غور کر لے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہیں، ایک ایسی اٹل اور لاعلاج کش مکش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہیں دوسری طرف برٹش گورنمنٹ؟ اور دونوں باتیں آپس میں لڑگئی ہیں کہ کسی طرح بھی جمع نہیں ہوسکتیں۔

اگر انسان کے ہاتھ اشارے کر کے طوفان اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح ہے جو سمندر کے کنارے کھڑا ہے اور اپنا ہاتھ ہاتھ ہلا ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔

فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کا نشہ چند لمحوں کے لیے عقل وانصاف کو کام کرنے دے۔

مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو۔ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟

اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔

یا مسلمانوں کے لیے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو جائیں۔

یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پرواہ نہیں ہے نہ وہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے زیادہ سے زیادہ حکومت چاہیے موصل کے تیل کے چشمے چاہئیں، عراق کی زرخیز زمین کی دولت چاہیے اور اسلامی خلافت کا خاتمہ تا کہ دنیا میں اس کا کوئی اسلامی حریف باقی نہ رہے۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی احکام متصادم ہوتے ہیں، تو ہوں۔ اگر ان پر طرح طرح کے اشد فرائض عائد ہو جاتے ہیں تو

ہوا کریں۔ ان کو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار غلام بنا رہنا چاہیے اگرچہ اس کی خاطر انہیں اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہو جانا پڑے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لیے بھی نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و غل میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں۔

نظامِ عمل

مسلمانانِ ہند اور نظامِ جماعت

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا تھا صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس بارے میں مسلمانوں کے لیے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آ جائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

''جماعتی زندگی کی معصیت'' سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک ''جماعت'' بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں ''بھیڑ'' اور ''انبوہ'' کا حکم رکھتی ہیں جماعت کا حکم نہیں رکھتیں۔ ''بھیڑ'' اور ''جماعت'' میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے جب کوئی تماشا ہو رہا۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت اور ایک ہی امام کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں۔ وہاں ان کے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے۔ افراد و اشخاص کوئی شے نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و عادات میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکا یک برباد نہیں کر دیتے بلکہ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے مسلمانانِ ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے

کتاب وسنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں:

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم وعمل مسلمان پر جمع ہو جائیں اور وہ ان کا امام ہو

وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان وصداقت کے ساتھ قبول کریں۔

قرآن وسنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، ان کی بلاچون وچرا تعمیل واطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گونگی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو۔ سب کے دماغ بیکار ہو جائیں صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے اور صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے۔ مگر نہ تو ''جماعت'' ہے نہ ''امت'' نہ ''قوم'' نہ ''اجتماع'' اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں۔ کنکر ہیں، مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کر دی جا سکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر سکتی ہیں۔

کسی گزشتہ فصل میں بہ ضمن شرح حدیث حارث اشعری ''جماعت'' کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے اس موقع پر وہ پیش نظر رہے۔

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدوجہد کی تمام گذشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کر دی۔ حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آ گیا جس کی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے: فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ (۴۷:۱۸)۔ اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا۔ سچے کام کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے، مگر جب بھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی معصیت اور ہلاکی ہے لیکن جب کبھی کر دیا جائے، سچائی اور نیکی ہے اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی۔

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سن پاتے ہو اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اٹھتا ہے، یکایک اعتقاد

اور عمل دونوں تمہیں یاد آ جاتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں میں ہی تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے۔ تمہاری مصیبت دائمی، تمہارا ماتم ہمیشگی کا، تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا اور تمہاری نحوست چوبیس گھنٹے تمہاری ساتھی ہے اور ٹھیک اسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سائے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے اور ہر آن و ہر لحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

تم وقت پر سامنے آ جانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روز نئے نئے روگ لگتے رہیں گے۔ خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا۔ پس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے اور قوم و فرد کو دونوں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے ایمان کی گم گشتگی اور محرومی کا ہے۔

درازی شب و بیداری من ایں ہمہ نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے؟ اگر آج مسلمانوں میں ان کے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے تو ان میں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کار بند ہو جاتے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے، ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دہنے بلاتا ہے، کوئی بائیں۔ کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، یہ مہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و خواص سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر ایک ایک لحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوائے شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اس کا اہل ہے نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پا سکتا ہے اس کو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کر سکتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید ہے؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں، وہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے لیکن اگر صحیح راہ عمل نہ اختیار کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جا سکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اس کی طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی۔ وہ ٹرین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔

''جذبات'' اسی وقت کام دے سکتے ہیں جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم وقضا کے لیے ''ادراک'' اور ''دماغ'' بھی موجود ہو۔ و ذلک من عمل النبوة ولکن لایعقلھا الا العالمون.

بہر حال اس وقت اور ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے راہ عمل'' یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں۔ اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں۔

تمام مسلمانوں کو ان ہمدردانِ ملت کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اس کی شاخوں کے قیام کا سروسامان کیا۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام مسلمانوں کو جماعتی و شرعی نظام کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی، ایجی ٹیشن جاری رکھے گی، تبلیغ و اشاعت کرے گی۔ لیکن نہ تو وہ قوم کو سنبھال سکتی ہے نہ کمیٹیوں سے ''جماعت'' پیدا ہو سکتی ہے نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کے لیے، اپنے قیام و تکمیل کے لیے۔ رفع تفرقہ و انتشار کے لیے اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کے لیے ایک بالاتر قوت حاکمہ و نافذ کی محتاج ہے اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اس کی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے اور اخباروں میں آرٹیکل لکھے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی بنائی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالات پر اصول و احکام شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کارروائی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا۔ امت و شرع کے اصول مصالح و مقاصد اس کے سامنے ہوں گے، کسی ایک گوشے ہی میں مستغرق نہ

ہوجائے گا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پرواہ ہوجائے۔

حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء

سب سے بڑھ کر یہ کہ اعمال ہمہ امت کی راہ حق میں منہاج نبوت پر اس کا قدم استوار ہوگا اوران ساری باتوں کے علم وبصیرت کے بعد ہر وقت، ہر تغیر، ہر حالت، ہر جماعت کے لیے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکے گا۔

زبان زنکتہ فرو ماند و راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

عزیزانِ ملت! اس طول طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی افسانہ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دہراتا رہا ہوں اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں تو تم اس کی تصدیق کرو گے تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (۷:۷۹)۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و اُبھار و ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر اور نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت ہے اور نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دل ہے، نہ دماغ، وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں۔ مگر تمہارے سینے کے اندر دل نہیں پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں؟ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے

تم نے اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷۱:۷) کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لیکن فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا (۷۱:۶) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں اب میں پھر تم

میں واپس آ گیا ہوں لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسے کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آئی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اتارو۔ ایسے پرجوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہیں اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کردو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اس جوشِ استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔

افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو اور تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نہ جست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را گوش آں منظور نیست

میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں کبھی یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹکل حکمتِ عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع۔ لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمدللہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا وہ میرے عقائد و معلومات تھے، تمہارے بڑوں کی طرح آراء و مظنونات نہ تھے۔ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳:۲۸) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزاء کیا۔ کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرت دعووں کا اعلان ہے: یرید ان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسوں گری ہے: اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۲۵:۵) لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب انہیں "مافوق الفطرۃ دعووں" اور "ساحرانہ فصاحت طرازیوں" کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو اور "قیام شریعت" اور "تقدیم و اتباع شریعت" اور "حفظ و دفاع ملت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔

پس جبکہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے

تجربہ کا وقت آ گیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کرو دیکھو

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ
(۴۴:۴۰)

ضمیمہ (ا)
جدول سنین خلافت اسلامیہ

نمبر	نام خلفاء	سنہ ہجری	سنہ مسیحی
۱	ابوبکر صدیقؓ	۱۱	۶۳۲
۲	عمر بن خطابؓ	۱۳	۶۳۴
۳	عثمان بن عفانؓ	۲۳	۶۴۴
۴	علی بن ابی طالبؓ	۳۵	۶۵۲
	سلسلہ بنو امیہ		
۵	معاویہؓ بن ابی سفیانؓ	۴۱	۶۶۱
۶	یزید بن معاویہؓ	۶۰	۶۸۰
۷	معاویہ بن یزید	۶۴	۶۸۳
۸	مروان بن الحکم	۶۴	۶۸۳
۹	عبدالملک بن مروان	۶۵	۶۸۴
۱۰	الولید بن الملک	۸۶	۷۰۵
۱۱	سلیمان بن عبدالملک	۹۶	۷۱۴
۱۲	عمر بن عبدالعزیز	۹۹	۷۱۷
۱۳	یزید بن عبدالملک	۱۰۱	۷۱۹
۱۴	ہشام بن عبدالملک	۱۰۵	۷۲۳
۱۵	الولید بن یزید بن عبدالملک	۱۲۵	۷۴۲
۱۶	یزید بن الولید	۱۲۶	۷۴۳
۱۷	ابراہیم بن الولید	۱۲۶	۷۴۳
۱۸	مروان بن محمد بن مروان	۱۲۷	۷۴۴
	سلسلہ عباسیہ		
۱۹	ابوالعباس سفاح	۱۳۲	۷۴۹

۲۰	ابوجعفر منصور	۱۳۷	۷۵۴
۲۱	المہدی بن منصور	۱۵۸	۷۷۴
۲۲	الہادی بن المہدی	۱۶۹	۷۸۵
۲۳	ہارون الرشید بن المہدی	۱۷۰	۷۸۶
۲۴	محمد الامین بن ہارون	۱۹۳	۸۰۸
۲۵	المامون بن ہارون	۱۹۸	۸۱۳
۲۶	المعتصم بن ہارون	۲۱۸	۸۳۳
۲۷	الواثق بن المعتصم	۲۲۷	۸۴۲
۲۸	المتوکل علی اللہ بن المعتصم	۲۳۲	۸۴۷
۲۹	المستنصر باللہ بن المتوکل	۲۴۷	۸۶۱
۳۰	المستعین باللہ بن المعتصم	۲۴۸	۸۶۲
۳۱	المعتز باللہ بن المتوکل	۲۵۲	۸۶۶
۳۲	المہتدی باللہ بن الواثق	۲۵۵	۸۶۹
۳۳	المعتمد باللہ بن المتوکل	۲۵۶	۸۷۰
۳۴	المعتضد باللہ بن الموفق	۲۷۹	۸۹۲
۳۵	المقتدر باللہ بن الموفق	۲۹۵	۹۰۸
۳۶	الراضی باللہ بن المقتدر	۳۲۲	۹۳۳
۳۷	المتقی باللہ بن المقتدر	۳۲۹	۹۴۰
۳۸	المستکفی باللہ بن المتقی	۳۳۳	۹۴۴
۳۹	المطیع باللہ بن المقتدر	۳۳۴	۹۴۶
۴۰	الطائع باللہ بن المطیع	۳۶۳	۹۷۴
۴۱	القادر باللہ بن المقتدر	۳۸۱	۹۹۱
۴۲	القائم بامر اللہ بن القادر	۴۲۲	۱۰۳۱
۴۳	المقتدی باللہ بن القائم	۴۶۷	۱۰۷۵
۴۴	المستظہر باللہ بن المقتدی	۴۸۷	۱۰۹۴
۴۵	المسترشد باللہ بن المستظہر	۵۱۲	۱۱۱۸
۴۶	الراشد بن المسترشد	۵۲۹	۱۱۳۵

۴۷	المقتفی بن المستظہر	۵۳۰	۱۱۳۶
۴۸	المستنجد باللہ بن المقتفی	۵۵۵	۱۱۶۰
۴۹	المستضی بنور اللہ بن المستنجد	۵۶۶	۱۱۸۰
۵۰	الناصر الدین اللہ بن المستضی	۵۷۵	۱۱۷۰
۵۱	الظاہر باللہ بن الناصر	۶۲۲	۱۲۲۵
۵۲	المستنصر باللہ بن الظاہر	۶۲۳	۱۲۲۳
۵۳	المستعصم باللہ بن المستنصر	۶۴۰	۱۲۴۳
	عباسیہ مصر		
۵۴	المستنصر باللہ	۶۵۶	۱۲۵۸
۵۵	الحاکم بامر اللہ	۶۶۱	۱۲۶۲
۵۶	المستکفی باللہ	۷۰۱	۱۳۰۱
۵۷	الواثق باللہ	۷۴۰	۱۳۳۹
۵۸	الحاکم بامر اللہ	۷۴۲	۱۳۴۱
۵۹	المعتضد باللہ	۷۵۳	۱۳۵۲
۶۰	المتوکل علی اللہ	۷۶۳	۱۳۶۱
۶۱	الواثق باللہ	۷۸۵	۱۳۸۳
۶۲	المستعین باللہ	۸۰۸	۱۴۰۱
۶۳	المعتضد باللہ	۸۱۵	۱۴۱۲
۶۴	المکتفی باللہ	۸۴۰	۱۴۴۱
۶۵	القائم بامر اللہ	۸۵۴	۱۴۵۰
۶۶	المستنجد باللہ	۸۵۹	۱۴۵۴
۶۷	المتوکل علی اللہ	۸۸۴	۱۴۷۹
۶۸	المستمسک باللہ	۹۰۳	۱۴۹۷
۶۹	المتوکل علی اللہ	۹۱۲	۱۵۰۶
	سلسلہ عثمانیہ		
۷۰	سلیم خان اوّل	۹۲۳	۱۵۱۷
۷۱	سلیمان اوّل	۹۲۶	۱۵۲۰

۷۲	سلیم ثانی	۹۷۴	۱۵۶۶
۷۳	مراد ثالث	۹۸۲	۱۵۷۴
۷۴	محمد ثالث	۱۰۰۴	۱۵۹۶
۷۵	احمد اوّل	۱۰۱۲	۱۶۰۴
۷۶	مصطفےٰ اوّل	۱۰۲۷	۱۶۱۸
۷۷	عثمان ثانی	۱۰۲۷	۱۶۱۸
۷۸	مراد رابع	۱۰۳۲	۱۶۲۳
۷۹	ابراہیم اوّل	۱۰۴۹	۱۶۴۰
۸۰	محمد رابع	۱۰۵۳	۱۶۷۴
۸۱	سلیمان ثانی	۱۰۹۹	۱۶۸۷
۸۲	احمد ثانی	۱۱۰۲	۱۶۹۱
۸۳	مصطفیٰ ثانی	۱۱۰۶	۱۶۹۵
۸۴	احمد ثالث	۱۱۱۵	۱۷۰۳
۸۵	محمد اوّل	۱۱۴۲	۱۷۳۰
۸۶	عثمان ثالث	۱۱۲۸	۱۷۵۴
۸۷	مصطفےٰ ثالث	۱۱۷۱	۱۷۵۷
۸۸	عبدالمجید اوّل	۱۱۸۷	۱۷۷۳
۸۹	سلیم ثالث	۱۲۰۳	۱۷۸۹
۹۰	مصطفےٰ رابع	۱۲۲۲	۱۸۰۷
۹۱	محمود ثانی	۱۲۲۳	۱۸۰۸
۹۲	عبدالمجید	۱۲۵۵	۱۸۳۹
۹۳	عبدالعزیز	۱۲۷۷	۱۸۶۱
۹۴	مراد خامس	۱۲۹۳	۱۸۷۶
۹۵	عبدالحمید ثانی	۱۲۹۳	۱۸۷۶
۹۶	محمد خامس	۱۳۲۴	۱۹۰۸
۹۷	امیر المؤمنین السلطان محمد خان سادس خلد اللہ ملکہ وشوکتہ	۱۳۳۶	۱۹۱۸

(۲)

مواعید وعہود

اس کتاب میں گورنمنٹ انگلستان وہند کے جن وعدوں اور سرکاری اعلانات کی طرف جابہ جا اشارہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) گورنمنٹ آف انڈیا کا اعلان جو ترکی کے شامل جنگ ہونے کے بعد ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا:

برطانیہ عظمٰی اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ برطانیہ کو اس کا سخت افسوس ہے کہ یہ بڑے مشورے اور بلا کسی اشتعال کے اور خوب سوچ سمجھ کر دولت عثمانیہ کی طرف سے عمل میں لائی ہے لہٰذا ہز ایکسلنسی وائسرائے ہند ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدسہ کے بارے میں جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہے، مندرجہ ذیل اعلانات کرتے ہیں" کہ ہز میجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

ان مقامات مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانی بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا۔ نہ ان کو ستایا جائے گا جب تک کہ حجاج و زائرین ہند سے جو ان مقامات مقدسہ میں جائیں، کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی آستدعا پر گورنمنٹ فرانس و روس نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے۔

(۲) ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا :

"ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دار الخلافے سے محروم کر دیں یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز و شہرہ آفاق علاقے لے لیں جن میں ترکی النسل آبادی کا جزو غالب ہے۔

ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی ہے، وہاں ترکوں کی سلطنت قائم ہے یا قسطنطنیہ اس کا پایہ حکومت ہو۔ البتہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کے درمیانی راستہ کو بین الاقوامی ضبط ونگرانی میں لانے کے بعد ہماری رائے میں عرب آرمینیا، عراق، شام اور فلسطین اپنی

اپنی جداگانہ قومی حکومتوں کے مستحق ہیں۔

وزیراعظم نے یہ جو کچھ کہا تھا؟ کیا محض ان کی ذاتی رائے تھی جس کی ذمہ داری صرف ان پر عائد ہوتی ہے یا برطانیہ کا سرکاری اعلان تھا؟ اور اگر سرکاری اعلان تھا تو صرف وزارت اور اس کی گورنمنٹ کا تھا یا تمام برٹش قوم اور امپائر کا؟

اس کا جواب اس تمہید سے ملتا ہے جو اس تقریر کے ابتدا میں موجود ہے:

"اس تمام بحث و گفتگو کے بعد جو قلمرو کے مختلف الخیال اور مختلف الرائے طبقوں کے نمائندوں کے ساتھ ہوئی ہے میں خوشی سے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ آج جو کلمات کہوں گا ان کے لیے گو تنہا حکومت ہی ذمہ دار ہوگی مگر ہمارے جنگی مقاصد، شرائط صلح کی نوعیت اور اس کی غرض وغایت کے متعلق میرے جو بیانات آپ سے اور آپ کی معرفت تمام دنیا سے ہوں گے، ان سے تمام قوم متحد و متفق ہے۔ میں دلیری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف گورنمنٹ کے مافی الضمیر ہی کی نہیں بلکہ تمام قوم اور تمام قلمرو کی بحیثیت مجموعی ترجمانی کر رہا ہوں۔

پھر ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء کو ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرتے ہوئے اس اعلان کی نسبت وزیراعظم کہتے ہیں۔

"ہمارا وہ اعلان بہت وسیع المعنی تھا اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ تمام جماعتوں کی مرضی کے مطابق تھا۔ مزدوروں کی جماعت بھی اس سے متفق تھی۔"

(۳) پریسیڈنٹ امریکہ مسٹر ولسن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو چودہ شرطوں کا اعلان کیا تھا جو باتفاق فریقین صلح کے لیے بنیادی شرطیں قرار پائی تھیں ان میں بارہویں شرط یہ تھی۔

"موجودہ سلطنت عثمانی میں ترکی کا جو حصہ ہے اس کو یقین دلایا جائے گا کہ اس کی وہ سلطنت محفوظ رہے گی لیکن دوسری اقوام جو سلطنت ترکی کے زیر حکومت ہیں انکو بھی اس کا اطمینان دلا دیا جائے کہ ان کی جان و مال محفوظ رہے اور ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔"

(۴)

ایفاء عہد

یہ وعدے جس طرح پورے کیے گئے، ان کی مختصر تفصیل یہ ہے

(۱) گورنمنٹ ہند نے عراق پر حملہ کیا جس کا بڑا حصہ جزیرہ عرب کے مقدس حدود میں داخل ہے۔

(۲) ۲۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی بندرگاہ اور زیارت گاہ ہے۔

(۳) ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پارک پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار ہے۔

(۴) مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

(۵) ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس میں برطانوی فوجیں داخل ہوئیں اور انگریزی قبضہ کا اعلان کیا گیا جو اسلام کی مقدس زیارت گاہ اور تین مقدس مقامات میں سے ایک اہم مقام ہے۔

(۶) ۵ جون ۱۹۱۹ء کو خاص سرزمین حجاز میں سازش کی گئی اور شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت وخون کا بازار گرم ہوا اور حدود حرم میں گولہ باری ہوئی۔

(۷) حسب تصریح نامہ نگار لندن ٹائمس بندرگاہ جدہ پر گولہ باری کی گئی۔

(۸) میجر راس کے ہوائی جہاز نے عین مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے (جیسا کہ ڈاکٹر ہاگرتھ نے فروری ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال آکسفورڈ کی تقریر میں بیان کیا؟

(۹) کوفہ، کربلائے معلی، نجف اشرف پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

(۱۰) ترکی کو تھریس کے علاقہ سے مع ایڈریانوپل کے محروم کر دیا گیا جہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ہے۔

(۱۱) صلح نامہ، ترکی کی دفعہ ۳۶ کے مطابق ترکی سے اس کے دارالسلطنت کی خودمختارانہ فرمانروائی بھی سلب کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

(۱۲) سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور زرخیز مقام ہے، ترکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے اس قدر ظلم وستم کیے کہ بے شمار جانیں ہلاک وتباہ ہوگئیں اور ہو رہی ہیں۔

(۱۳) صلح نامہ کی شرائط نے بقیہ ایشیائے کوچک کے مالی اور ہر طرح کے فوجی اختیارات کی خودمختاری سے بھی ترکی کو محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا۔ چند چھوٹے

جنگی جہازوں کے علاوہ کوئی بحری قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی عیسائی رعایا پر اسے کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس کی حیثیت بالکل ایک ماتحت ریاست کی سی ہوگئی ہے جو برائے نام پادشاہت سے ملقب کردی گئی ہو۔

(۱۴) صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی واسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انہیں حاصل تھے اور جن کے الگ کر دینے کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے۔

"حکومت ٹرکی اپنے تمام اختیارات سے جو حکم برداری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی ہے بالکل دست بردار ہوتی ہے۔" "ٹرکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کے اختیارات ان ممالک پر نہ رکھے گی جو ٹرکی سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔"

حالانکہ شرعاً منصب خلافت کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں پر اس کو ایک بالاتر اختیار رہو اور وہ تمام اسلامی دنیا میں ایک مرکزی اسلامی اقتدار کی حیثیت رکھے لیکن اس دفعہ نے ٹرکی کو ان تمام اختیارات خلافت سے محروم کر دیا اور اسلامی خلافت اپنے کامل معنوں میں پارہ پارہ ہوگئی۔

(۱۵) شام کو ٹرکی سے الگ کر کے آزادی نہیں دی گئی بلکہ فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کیا گیا۔ شام کی تمام آبادی انسانیت وصداقت عہد کے نام پر فریاد کرتی رہی اور فرانس کی فوجوں نے اس پر جبراً قبضہ کر لیا۔

(۱۶) عراق کی آبادی کو خود مختاری و آزادی نہیں دی گئی بلکہ برطانیہ نے اس کی حکم برداری کا دعویٰ کیا اور اس پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ وہاں کی آبادی ایفائے عہد کا مطالبہ کرتے کرتے مایوس ہوگئی اور اب بزور شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ ان کو "باغی" کہا جا رہا ہے حالانکہ اگر برطانیہ کے اعلانات سچے تھے اور اس کی فوجیں "رعایا" بنانے کے لیے نہیں بلکہ آزاد کرانے کے لیے کی گئی تھیں تو وہ "باغی" کیونکر ہو سکتے ہیں بغاوت کا اطلاق رعایا کی شورش پر ہوتا ہے نہ کہ کسی آزاد جماعت کی شمشیر زنی پر۔

(۱۷) یہ تمام نتائج صلح نامہ ٹرکی کے ہیں لیکن قبل اس کے کہ ٹرکی اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ صلح کرے برٹش فوجوں نے دار الخلافت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بالکل ایک نظر بندی قیدی کی سی ہوگئی۔ اس قبضہ کی وجہ سے اسلام کے دار الخلافت میں جو دردانگیز واقعات وحوادث پیش آئے اور عثمانی خلافت عظمیٰ کی متصل پانچ صدیوں میں پہلی مرتبہ جو توہین ہوئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ وہ سلوک ہے جو نہ تو جرمنی کے ساتھ کیا گیا نہ آسٹریلیا کے ساتھ اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔

❁……❁……❁

ایڈریانوبل کی جامع مسجد کا بیرونی منظر

حتیٰ المحاریب تبکی و هی جامدة حتیٰ المنابر ترثی و هی عیدان!
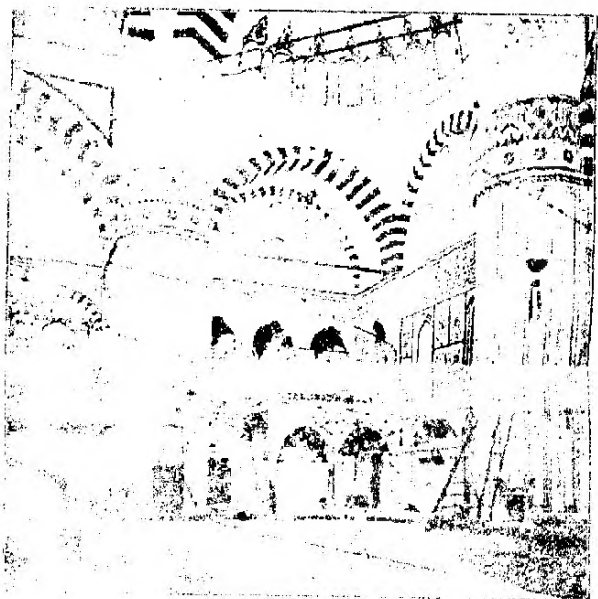
ایڈریانوبل کی جامع مسجد ... جو بقیہ یورپین ترکی میں اسلام کی آخری متاعِ عزت تھی اور یونان کے سپرد کر دی گئی!

مسئلہ خلافت

مسئلہ خلافت پر جس جامعیت اور ہمہ گیریت سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے راہوار قلم کو مہمیز دی ہے' وہ صرف اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے قارئین پر واضح ہوسکتی ہے۔ امام الہند نے خلافت کے لغوی کنہہ سے لے کر معنوی انتہا تک سفر جس شان سے اس کتاب میں قطع کیا ہے' اس کے سامنے فکر ونظر کی ساری جولانیاں ماند پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ امام الہند جس طرح بحث کو "وامرھم شوریٰ بینھم" کے سٹیج سے اٹھا کر "انا امرکم بخمس......" کے میدان میں لائے ہیں اور پھر اسے ایک مرکز...... "المرکز الجامع"...... تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں وہ صرف اس کتاب کو پڑھنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

مولانا نے دوسرے ایڈیشن میں بعض ضروری ترامیم واضافہ کر کے اِسے شائع کیا تھا جبکہ ہمارے ہاں پہلا ایڈیشن ہی شائع ہوتا رہا۔ زیرنظر ایڈیشن پہلی بار مولانا کے تصحیح شدہ اصل نسخہ کے مطابق شائع کیا جارہا ہے۔

مکتبہ جمال تیسری منزل حسن مارکیٹ اُردو بازار لاہور